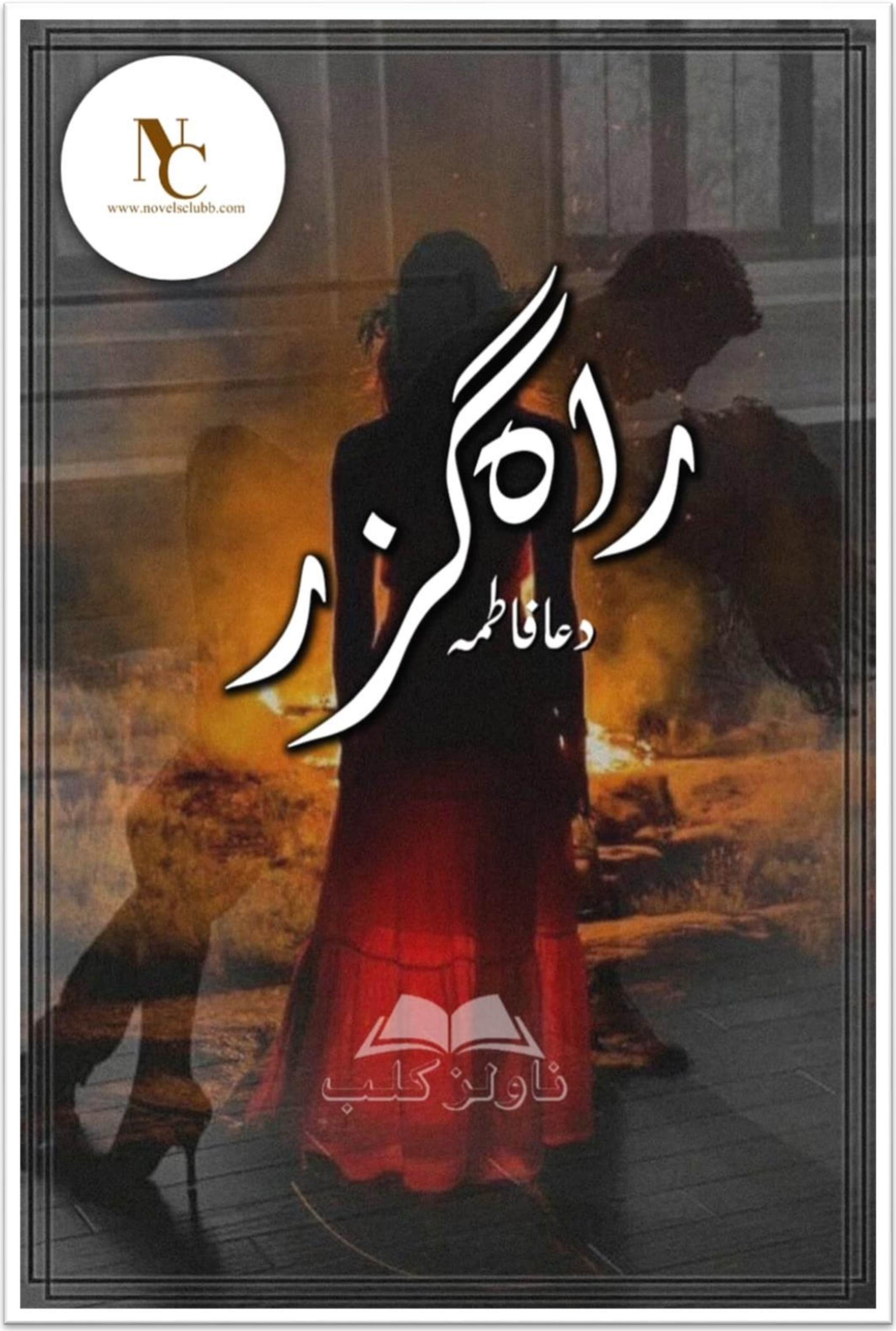
www.novelsclubb.com
راہ گزر
دعا فاطمہ
ناولز کلب

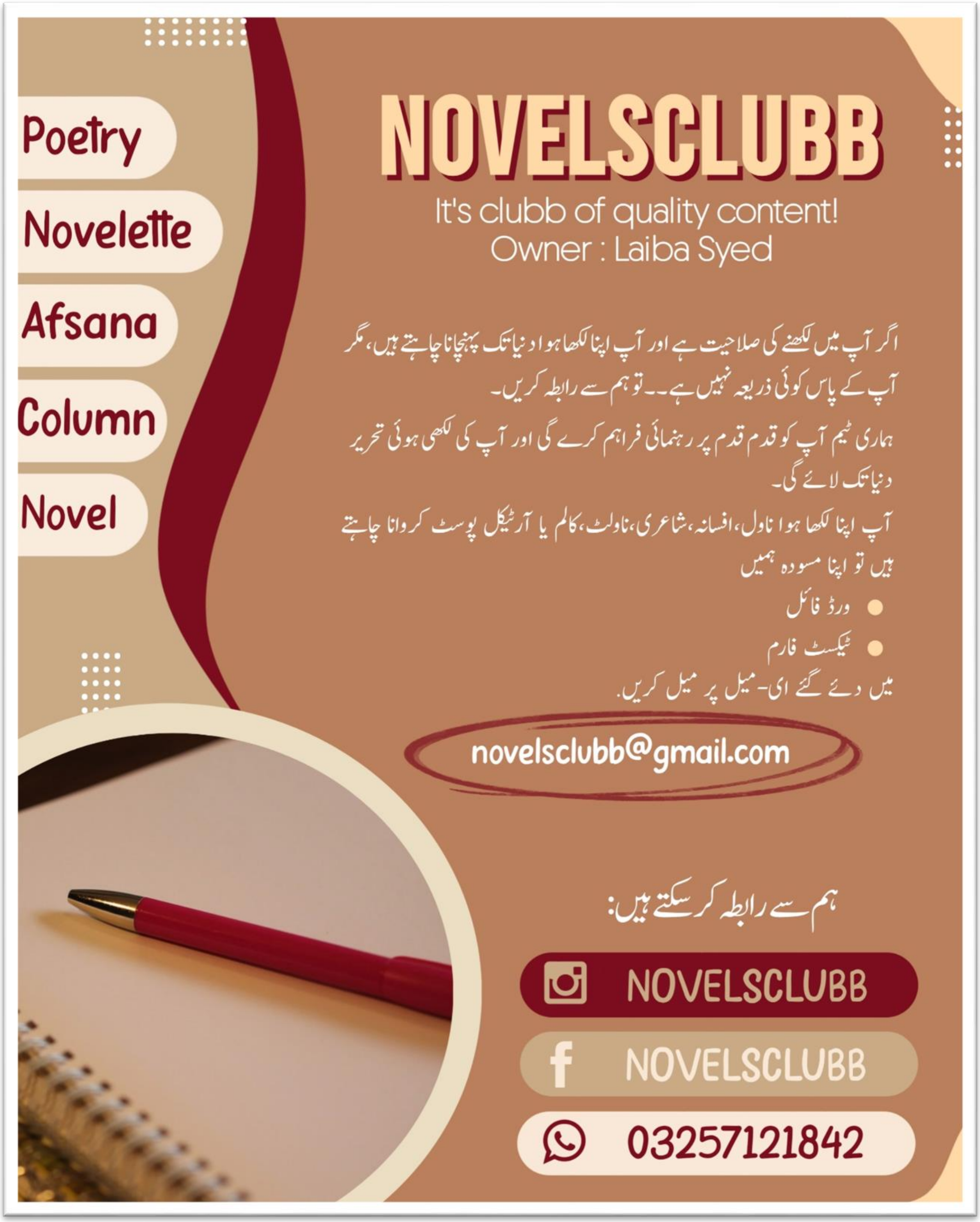

Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel

NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔ تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں

- ورڈ فائل
- ٹیکسٹ فارم

میں دئے گئے ای-میل پر میل کریں.

novelsclubb@gmail.com

ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:

NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

راہ گزر

از قلم

دعا فاطمہ

انتساب

میری زندگی اور اس کی تلخیوں کے نام۔۔۔ زندگی کے حقیقی چہرے کے نام۔۔۔ زندگی کی تلخ گہرائیوں کے نام!

پیش لفظ

یہ کہانی ہے ایمان زاویار کی۔۔۔ اس ایمان زاویار کی جو زندگی کے شروع ہوتے ہی اس کی تلخیوں سے جا ملتی ہے۔ اس ایمان زایار کی جو زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ایمان کھو بیٹھتی ہے۔ اس ایمان زاویار کی جس کی زندگی کی تلخیاں ہی اسے اس کا امیان واپس لوٹاتی ہیں۔ اس ایمان زاویار کی جو صرف اپنے آپ کے ساتھ اس دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔

کہانی ہے زندگی کی۔ اس زندگی کی جو اپنا خوبصورت نقاب اتار پھینکتی ہے۔ اس زندگی کی جس کی بدصورت حقیقت سامنے آتی ہے۔ اس زندگی کی جو انسان کو چاروں اور سے گھیرے اس کو تنہا کر ڈالتی ہے۔

کہانی ہے راتوں کو رونے والوں کی، کہانی ہے سسکنے والوں کی، کہانی ہے اکیلے رہ جانے والوں کی۔۔۔

کہانی ہے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّانے والے رمیص جہانزیب کی۔۔۔

کہانی ہے دور پردیس میں کہیں کھو جانے والے ارتضی مراد کی۔۔۔

داستان ہے غزل ارشد کی۔۔۔ داستان ہے ایمان زاویار کی۔۔۔

اس کہانی کی سب سے ڈیزرونگ لکھاری میری نانی ہیں جنہوں نے میری تھیم سن کر ایک ہی بار میں مجھے میری کہانی کا نام بتا کر مجھے میری ناول کا پلاٹ، کلائمیکس اور اختتام تھما دیا۔ میری کہانی کو ایک نیا رخ بخشا۔ ارشد شریف شہید کی سوانح عمری کچھ الگ لفظوں میں بیان کر کے میں نے ایک اور تھیم کو اس ناول کا حصّہ بنایا ہے۔ سب سے آخر میں میری پوری کوشش ہے کہ میں اپنے ذہن میں قائم ہوئے اسباق کو باآسانی اس ناول کے ذریعے آپ تک پہنچا سکوں۔

والسلام

دعا فاطمہ

راہ گزر

مصنفہ: دعا فاطمہ

باب: 3

کچھ خواب ہوتے ہیں

جو اذیت لگتے ہیں

کچھ لوگ ہوتے ہیں

جو اپنے لگتے ہیں

کچھ نام ہوتے ہیں

جو سب کچھ لگتے ہیں

کچھ اشخاص ہوتے ہیں

جو زندگی لگتے ہیں

کچھ لمحے ہوتے ہیں

جو جامد لگتے ہیں

کچھ پل ہوتے ہیں

جو حسین لگتے ہیں

کچھ گھر ہوتے ہیں

جو چھاؤں لگتے ہیں

کچھ آشیانے ہوتے ہیں

جو قید لگتے ہیں

(از خود)

حیدر آباد پر اترا سورج آج پورے آب وتاب سے چمکتا، خطے کا ہر کونہ روشن کر رہا تھا۔ گرمی ٹھیک ٹھاک قسم کی تھی۔ ہوائیں تھیں گویا لو کی مانند۔ گرم تھپیڑوں کی جیسی۔ ایسے میں ایک گھر کا منظر دیکھا جاتا تو اس میں اس وقت پانچ لوگ کمرے میں اکٹھے ہوئے بیٹھے تھے۔

سادہ سے شلوار قمیض پہنا وہ شہد رنگ آنکھوں والا لڑکا بڑے راز و نیاز کے سے انداز میں سرگوشی نما آواز میں کچھ کہتا جا رہا تھا جسے اس کے باقی چار ساتھی خوب غور سے سن رہے تھے۔ سبھی کے چہروں پر فکر اور سوچ کی گہری پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔ کمرے کی کھڑکیاں دروازے سب بند تھے۔ محض ایک ہلکے پاور والا بلب تھا جو پورے کمرے کو ہلکا روشن کیے ہوئے تھا۔

"تمہاری ساری بات ٹھیک ہے، رضا۔ مگر یہ بتاؤ کہ کتنے بجے کرنا ہے یہ سب؟"، سبز آنکھوں والی لڑکی نے پوری بات سن کر آخر میں کچھ جھنجھلا کر پوچھا تھا جس پر بات کرتے رضا نے ذرا ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔

"اوہو۔ میرو۔ اسے بات تو مکمل کرنے دو۔"، مونی نے خاصی سمجھداری سے کہا تو میرو بھی سر

اثبات میں ہلاتی خاموش ہو گئی۔

"اچھا۔۔۔ میری ساری باتیں ذہن میں تو بٹھالی ہیں ناں؟"، رضا نے اب کے پوچھا تو باقی چاروں نے سرعت سے سر اثبات میں ہلایا۔

"روضہ کس کس کا ہے؟"، اس کے اگلے سوال پر سب نے ہی اپنا ہاتھ بلند کیا سوائے کاکا کے۔ وہ سب کے بلند ہاتھ دیکھ کر کچھ جھینپ سا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ نہ کھڑا کرنے پر ان سب نے اسے دیکھا تھا۔ کچھ حیرت سے۔ کچھ بے یقینی سے۔

"تم نے روضہ نہیں رکھا، کاکا؟"، مونی نے بہت ہی زیادہ بے یقینی سے پوچھا تھا۔ باقی سب کی آنکھوں میں بھی سوال تھا۔ کاکا ہلکا سا مسکرایا تھا۔ جھینپ کر۔

"نہیں۔"، سر دھیرے سے نفی میں ہلا کر جواب دیا۔

"کیوں؟"، روحان نے خاصی حیرت سے پوچھا تھا۔

"وہ اصل میں میں ابھی چھوٹا ہوں ناں، جبھی امی نے کہا کہ جب بڑے ہو جاؤ گے تب رکھنا۔"، اس نے بات ان کے گوش گزار کی تھی۔

"میں اور میرو تو تم سے بھی چھوٹے ہیں۔ ہم نے تو رکھا ہے روضہ۔"، مونی نے خاصی حیرت سے جواب دیا تھا۔ کاکا نے نگاہیں ایک ایک کر کے ان سب پہ ڈالی تھیں اور پھر سر جھکا لیا تھا۔

"ڈاکٹر نے منع کیا ہے مجھے روضہ رکھنے سے۔"، اس نے جیسے شرمندگی سے بتایا تھا۔ جس پر سب کی بھنویں ناسمجھی سے اکٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے سمجھ نہ آیا ہو۔

"کیوں؟"، میرو نے اب کے خاصی دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"میں روضہ نہیں رکھ سکتا۔ میری طبیعت خراب ہے۔ جب صحیح ہو جائے گی تو رکھ لوں گا۔"، اس نے پوری بات نہیں بتائی تھی۔ رضا کی آنکھیں بے اختیار ہی پر سوچ انداز میں سکڑی تھیں۔ باقی سب اب بھی کنفیوژڈ سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ جب صحیح ہو جاؤ گے، تب رکھ لینا روضہ۔"، اب کے رضا نے بڑی سمجھداری سے جواب دیا تو جہاں کاکا نے تشکر سے اسے دیکھا، وہیں سب کی زبانوں کو چپ لگ گئی۔ رضا کا انداز ہی ایسا تھا کہ جیسے وہ سب کو اس موضوع کو ختم کرنے کی تنبیہ کر رہا ہو۔

سلسلۂ گفتگو وہیں سے جاری کر دیا گیا تھا جہاں سے چھوڑا گیا تھا۔

☆☆☆

منظر چند دن بعد کا ہے۔ آج شام بارش خوب ہو رہی تھی۔ ہر شے گویا بارش میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ آسمان کو گہرے سرمئی بادلوں نے ڈھک رکھا تھا۔ ایسے میں ماسٹر صاحب کے گھر کے باہر کوئی کھڑا دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ذرا غور سے قریب جا کر دیکھا جاتا تو وہ چھاتہ سر پر تان کر کھڑی مونی زاویار تھی۔

سادہ سیاہ رنگ کے شلوار قمیض پہنے، بالوں کو دو چوٹیوں میں گوندھے، وہ سرخ سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ کاندھے پر اپنا سیاہ بستہ لٹکا رکھا تھا۔ آنکھیں اور چہرہ رونے کی چغلی کھاتا تھا۔ کچھ ہی پلوں بعد اندر سے دروازہ کھولا گیا تھا۔ دروازے کا پٹ تھامے ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر حیرت ابھری تھی۔

"السلام علیکم سر۔"، مونی نے چہرہ اوپر اٹھا کر ان کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے سلام کیا تھا۔ ماسٹر صاحب کی آنکھوں کی الجھن بڑھی تھی۔

"وعلیکم السلام مونی۔ آج اتوار ہے، بیٹے۔ چھٹی ہے۔"، انہوں نے خاصی نرمی سے اسے یاد دلایا

تھا۔ مونی نے نگاہیں چرا کر اپنے جوتوں میں مقید پیروں پر جمائی تھیں۔

"آئی نو، سر۔"

اس کی آواز بہت ہلکی تھی۔ اتنی کہ بمشکل ہی ماسٹر صاحب کے کانوں تک پہنچ پائی تھی۔ ان کی آنکھوں میں اب کے ایک سوال سا جھلکا تھا۔ ابرو خود بخود ہی اکٹھی ہوئی تھیں۔ چہرے کی سنجیدگی بڑھی تھی۔

"تو کیوں آئی ہو؟"

برستی بوندوں کے درمیان چھاتہ تھامے کھڑی وہ کوئی چھوٹی سی مورت لگتی تھی۔ پس منظر میں بارش کی گرتی بوندوں نے ایک مدھر سا نغمہ پیدا کیا ہوا تھا۔ بادل ہر کچھ پلوں بعد زور سے گرج رہے تھے۔ بجلی بھی ساتھ ہی کڑک رہی تھی۔ مونی نے سرخ پڑتی آنکھیں اٹھا کر ماسٹر صاحب کو دیکھا تھا۔۔۔ اور پھر اگلے ہی پل اس کی آنکھوں سے ایک آنسو گرتا ہوا اس کے رخسار پر بہتا چلا گیا تھا۔

"سر، میں رونا چاہتی ہوں۔"، اس کی آواز میں اتنی کرچیاں محسوس ہوتی تھیں کہ ماسٹر صاحب

کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ بچّی انہیں بہت عزیز تھی۔ یوں تو وہ اپنے سبھی شاگردوں سے بہت محبت کرتے تھے، مگر مونی سے ان کا یہ تعلق بہت خاص تھا۔ انہوں نے ایک جانب کو ہو کر اسے اندر آنے کا عندیہ دیا تو وہ سر جھکائے، سوں سوں کرتی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے وہ دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے ہی چلے آئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ سر جھکائے رو تی جا رہی تھی اور وہ ترحم و ہمدردی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دائیں جانب بنے کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گھر میں بہت اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کا گھر چھوٹا سا، مگر بہت صاف ستھرا تھا۔

عمر صاحب چالیس پینتالیس برس کے نہایت نفیس سے آدمی تھے جو سالوں سے یہیں اس محلّے میں رہائش پذیر تھے۔ وہ پہلے پہل تو اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے، پھر ایک عمر کو پہنچ کر ان کی شادی ہو گئی تھی۔ ان کی بیوی، زاریا، ان کی ہم جماعت تھی جو یونیورسٹی میں ان کے ساتھ پڑھا کرتی تھی۔ ان دونوں کی محبت کی شادی ہوئی تھی۔

عمر صاحب ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں پروفیسر لگ گئے تھے جبکہ ان کی اہلیہ گھر پہ ہی بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھیں۔ زاریا کے پاس سے ہی آدم اور زرار ٹیوشن پڑھ کر جا چکے تھے۔ جب عمر صاحب تیس برس کے ہوئے تو ایک روزان کے والد کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا جس کی وجہ سے تمام تر اخراجات کی ذمّے داری ان پر آگئی تھی۔ چونکہ وہ زاریا کی کمائی میں سے کچھ بھی نہیں لیا کرتے تھے، سوا اپنا اور باقی سب کا خرچہ خود ہی پورا کیا کرتے تھے۔

پرائیویٹ جاب اور فیملی، دو ایسی چیزیں ہیں جو ساتھ ساتھ لے کر چلنا انتہائی دشوار کام ہے اور عمر صاحب یہ دشوار کام سرانجام دے رہے تھے۔ شادی کے سات سال تک ان کی گود خالی رہی تھی۔ آٹھویں سال ان کے ہاں دو جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی تھی۔ زاریا اور عمر کے تو جیسے پیر ہی زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔

ان کے بچے، ایمان اور تیمور، بالکل مونی کے برابر کے تھے۔ ابھی وہ دونوں سات سات سال کے ہی تھے کہ ایک روز وہ زاریا کے ساتھ اپنے ننھیال گئے تھے۔ عمر صاحب اور ان کی والدہ گھر پر ہی تھیں۔

اور پھر تیسرے دن ان کو ایک کال موصول ہوئی تھی۔ اور وہ کال ان کا سکون چھین لینے کے لیے کافی تھی۔ اس دن ان کی کل دنیا اجڑ گئی تھی۔ ان کی زندگی بے مقصد بن کر رہ گئی تھی۔ ان کے دونوں بچوں اور بیوی کے ساتھ ایک بہت خطرناک حادثہ پیش آگیا تھا، جس کے سبب زاریا اور ایمان موقع پر ہی دم توڑ گئی تھیں۔

تیمور کومہ میں چلا گیا تھا جبکہ اس کی ایک ٹانگ پیرالائز ہو گئی تھی۔ وہ بستر پر پڑ گیا تھا۔ عمر صاحب کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ ایک جھٹکا تھا جو سب لے گیا تھا۔ ایک طوفان تھا جو زندگی میں کہرام مچا گیا تھا۔

پھر زندگی میں آنے والے کچھ طوفان ایسے بھی ہوا کرتے ہیں جو زندگی کو زندگی نہیں رہنے دیتے۔ بس ایک مدّت بنا چھوڑتے ہیں جو جیسے تیسے کر کے پوری کرنی ہوتی ہے۔ ان کی زندگی بھی ایسی ہی نہ ختم ہونے والی ایک مدّت بن کر رہ گئی تھی۔ جو نہ خود ختم ہوتی تھی اور نہ انہیں ختم کرتی تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ وقت کی ایک خوبی ہوتی ہے کہ وہ گزرتے ہوئے مرہم بھرتا جاتا ہے۔ مگر ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ گزرتے ہوئے کچھ زخموں کو ناسور بھی بنا ڈالتا ہے۔ ایک ایسا ناسور جس کی تکلیف وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ جس کا درد جان لیوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ان کی تو زندگی ہی ان کے لیے ایک ایسا ناسور بن کر رہ گئی تھی۔

انہی دنوں انہوں نے خود کو مصروف رکھنے کی خاطر یونیورسٹی کے بعد ٹیوشن بھی پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اب ان کو ٹیوشن پڑھاتے تقریبا تین سال ہونے کو آئے تھے۔۔۔ اور ان تین سالوں میں اگر کوئی ایسا شاگرد تھا جو انہیں بے حد عزیز تھا، تو وہ تھی مونی زاویار۔ شاید یہ نام کے باعث تھا یا پھر اس کی معصومیت کے باعث۔۔۔ جو بھی تھا، ان کی محبت اس کے لیے بے انتہا تھی۔

وہ بھی ان سے خاصی قریب ہو گئی تھی۔ یوں تو پڑھائی کے وقت خوب سہمی رہتی تھی، مگر ویسے وہ اس کا اور باقی بچوں کا بہت خیال رکھا کرتے تھے۔ اس کے بہت سے دوست تھے۔ اسکول میں الگ۔ خاندان میں الگ۔ محلّے میں الگ۔ ٹیوشن میں الگ۔ مگر ماسٹر صاحب سے اس کی جو دوستی تھی ناں، وہ مثالی تھی۔ ایمان کو جو محبت کبھی باپ سے نہ مل سکی تھی، وہ اسے عمر صاحب

دیتے تھے۔

جب انسان کو اس کے اپنے رشتوں سے جائز محبت و احساس نہ ملے تو وہ محبت اور توجہ کا بھوکا ہونے لگتا ہے۔ وہ ہر کسی میں اس محبت اور اس توجّہ و احساس کو تلاشنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

وہ اپنی ہر بات ان سے شیئر کرتی تھی۔ وہ دکھی ہوتی تو ان کے ساتھ دکھ بانٹتی۔ خوش ہوتی تو ان کو بھی اپنی خوشی سناتی۔ غصّہ ہوتی تو ان کے سامنے غصّے کا اظہار کرتی۔ اذیت میں ہوتی تو ان کے سامنے ٹوٹ کر بکھر جاتی۔

آج بھی وہ ان کے سامنے ٹوٹی ہوئی آئی تھی۔ رونے کے لیے۔ دکھ کہنے کے لیے۔ غم بانٹنے کے لیے۔ دل ہلکا کرنے کے لیے۔ وہ جانتے تھے اسے۔ بہت اچھی طرح سے۔

"کیا ہوا ہے، مونی؟"، وہ بہت نرمی سے اسے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اتنی شفقت بھری نرمی تھی کہ وہ ان کے سامنے کھل جایا کرتی تھی۔ جبھی کچن سے آپا بی باہر آئیں

تو اسے دیکھ کر نرمی سے مسکرا دیں۔ مگر اگلے ہی پل اس کی سوجی ہوئی متورم آنکھیں دیکھ کر تفکر سے اس تک آئیں۔

"کیا ہوا ہے اسے، عمر؟"، وہ پریشانی سے عمر صاحب کو دیکھ کر پوچھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں پریشانی پنہاں تھی۔

"ابو نے بہت برا کیا ہے میرے ساتھ، سر۔"، وہ ایک گیلی سانس خارج کر کے اذیت سے بولی تھی۔ ماسٹر صاحب نے پریشانی سے آپا بی کو دیکھا تھا۔ آپا بی ایمان کے قریب آئی تھیں اور اس کے برابر میں ہی بیٹھ گئی تھیں۔

"ہم شادی میں جا رہے تھے۔۔۔ اور انہوں نے اتنی زور سے سب کے سامنے ڈانٹ کر کہا کہ۔۔۔"، اور وہ پھوٹ پھوٹ کر چہرہ منہ میں چھپائے رو دی تھی۔ ماسٹر صاحب کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ ان کو اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ کسی نے جیسے زوروں سے دل بھینچ ڈالا تھا۔

"کہ کیا، بچے؟"، آپا بی نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اس کی ٹھوڑی دو انگلیوں سے اٹھاتے

ہوئے بہت ہی اپنائیت اور نرمی سے پوچھا تھا۔

"کہ اس کو میک اپ کر کے سفید کرو۔"، وہ ہنوز چہرہ چھپائے متورم آواز میں بولی تھی۔ آپا بی بی نے تفکر اور افسوس سے اس کو خود سے لگا لیا تھا۔ ماسٹر صاحب کے چہرے پر افسوس کی گہری لکیریں تھیں۔ افسوس کہ وہ اس بچّی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بس خاموشی سے اسے آنسو بہاتے دیکھے گئے تھے۔ وہ آپا بی بی کے گلے سے لگی زار و قطار رو رہی تھی۔

ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ یہ تو ایک معمول سا تھا۔ ہر مہینے میں ایک بار تو مونی اس طرح سے روتی ہوئی ضرور آتی تھی۔ جبھی باہر دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھے۔ چٹخنی ہٹا کر دروازہ وا کیا تو سامنے ہی برساتی پہنے، چھاتہ تھامے آدم کھڑا تھا۔

اس کے چہرے پر تفکر اور پریشانی تھی۔

"السلام علیکم ماسٹر صاحب۔ مونی یہاں آئی ہے؟"، اس نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا، جس پر عمر صاحب نے کچھ توقف کے بعد سر اثبات میں ہلا کر ایک جانب کو ہوتے ہوئے اسے اندر آنے کی

جگہ دی تھی۔ وہ بھی چھاتے سمیت ہی اندر چلا آیا تھا۔ چھوٹی سی راہداری سے گزر کر وہ دونوں لاؤنج میں داخل ہوئے تو وہ سامنے ہی آپا بی سے لپٹی نظر آئی۔

"ایمان۔۔۔ آدم آیا ہے۔"، ماسٹر صاحب کے کہنے پر ایمان نے ایک دم سے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ سامنے ہی سنجیدہ سا آدم ماسٹر صاحب کے بغل میں کھڑا، اسے دیکھ رہا تھا۔ ایمان دھیرے سے آپا بی سے الگ ہوئی تھی اور ایک چور نگاہ آدم پر ڈال کر اپنا بستہ صوفے سے اٹھا کر کاندھے پر لٹکایا تھا۔ پھر اپنے پاؤں کے پاس پڑی چھتری اٹھا کر کھولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خداحافظ، سر۔"، دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے آپا بی کی جانب اپنا روٹھا روٹھا سا چہرہ موڑ کر انہیں دیکھا تھا۔

"خداحافظ، آپا بی۔"، وہ اب کے خاموشی سے سر جھکائے آدم تک چلی آئی تھی۔ آدم بھی ان دونوں کو خداحافظ کہتا اس کا ہاتھ تھامے وہاں سے چلا آیا تھا۔ پورے راستے وہ خاموش تھا۔ ایمان کی سماعتوں سے محض گرتی بارش کی آواز ٹکرا رہی تھی۔ ایک طوفان جو آدم زاویار کی آنکھوں میں وہ دیکھ سکتی تھی، وہ بہت خاموش سا تھا۔ آدم زاویار کے اندر اٹھتے ابال اور طوفان

ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔ خاموشی سے آ کر اس کے اندر ہی اندر پنپ کر نجانے کیسے اور کب ختم بھی ہو جایا کرتے تھے۔

آدم اسے ڈانٹتا نہیں تھا، نہ ہی کبھی اس پر چیختا تھا۔۔۔ بلکہ اس پر تو کیا، وہ تو کسی پر بھی غصّہ نہیں کرتا تھا، مگر پھر بھی کچھ تھا اس کی شخصیت میں، کچھ بارعب سا، کچھ پراسرار سا۔۔۔ کہ سب اس سے اور اس کے غضب سے ڈرا کرتے تھے۔ ایمان بھی اس وقت بے ہنگم ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ اس کے ساتھ چلتی جا رہی تھی جب یکدم ہی آدم کی سنجیدہ و سخت سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"ایمان۔۔۔ میں بہت مایوس ہوا ہوں آج تم سے۔" اس کی آواز میں ڈپٹ نہیں تھی، مگر کچھ ایسا ضرور تھا کہ ایمان کا سر جھکتا چلا گیا تھا۔ نگاہیں پیروں پہ جا ٹکی تھیں۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔

"انسان میں اتنا حوصلہ تو ہونا چاہئے کہ وہ اپنے دکھ خود جھیل سکے۔ دوسروں کے سامنے دکھوں کا اشتہار لگانا خود اپنی ذات اور اس کے رموز کو بے وقعت کرنا ہوتا ہے۔۔۔ کیا تم نے خود کو اتنا

بے وقعت کر لیا ہے؟"، اس کے لہجے میں ایک کاٹ سی تھی۔ ایک ناپسندیدگی سی جو ایمان کو خوب محسوس ہوئی تھی۔ اس نے ٹھہر کر سر موڑ کر، چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بھی بیچ راستے میں ہی رک گیا تھا اور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"وہ کوئی دوسرے نہیں ہیں۔"

"وہ پہلے بھی نہیں ہیں، ایمان۔ پہلا ہمیشہ صرف رب ہونا چاہئے۔۔۔ وہی رب جو تمہارے سارے دکھوں کو سمیٹ لیتا ہے۔ تمہارے سارے اشکوں کو اپنے دست رحمت میں جذب کر لیتا ہے۔ جو تمہارے دکھوں کو ختم کرنے اور کم کرنے پر قادر ہے۔ انسانوں کو دکھ سنانے کا کیا فائدہ؟ نہ وہ دکھ سمیٹ سکتے ہیں، نہ کم کر سکتے ہیں۔۔۔"

اس وقت ایمان کے کچّے سے ذہن میں آدم زاویار کی بہت سی باتیں نقش ہو کر اپنی چھاپ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ وہ ساکت سی کھڑی اسے سننے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یوں جیسے دماغ میں یہ سب بٹھانا مشکل لگ رہا ہو۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ پھر کبھی، زندگی کے کسی موڑ پر، کسی اذیت ناک گھڑی میں، کسی دردناک لمحے میں، اسے یہ ساری باتیں یاد آئیں گی۔ اور تب یہ

باتیں اسے صرف یاد نہیں آئیں گی۔ بلکہ اسے بہت کچھ سمجھا جائیں گی۔

"شکوہ کرنا ہے، دکھ کہنا ہے، انسانوں کی شکایت کرنی ہے۔۔۔ سب کرو۔ لیکن اس سے کرو جو شکوے دور کرنے، دکھ سمیٹنے اور انسانوں سے نمٹنے پر قادر ہے۔ اس طرح انسانوں کے سامنے دکھ کہنا خالی خولی سر دیوار میں مارنے سے زیادہ کچھ نہیں۔"، وہ کہتا جا رہا تھا اور وہ سنتی جا رہی تھی۔ نم سوجی ہوئی آنکھیں اب نم نہ رہی تھیں۔ اب وہاں ایک حیرت تھی۔ خدا کا یہ تعارف تو آج سے پہلے کبھی کسی نے بتایا ہی نہ تھا۔ خدا کا یہ تصور تو آج سے پہلے اس کے ذہن میں کبھی آیا ہی نہ تھا۔

وقت رک گیا تھا۔ سانسیں تھم گئی تھیں۔ دھڑکنیں سست پڑنے لگی تھیں۔ وہ دونوں گلی کے وسط میں کھڑے ساکت تھے۔ کسی مجسمے کے مانند۔

"انسان کبھی بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ ہاں، ان کا مالک و خالق سب کر سکتا ہے۔ اگر وہ دکھ دینے پر قادر ہے تو انہیں سمیٹنے پر بھی قادر ہے۔"، یہ کہہ کر آدم نے ایک نظر اسے دیکھ کر قدم آگے

بڑھائے تھے۔ اس کے قدم بھی خود بخود ہی حرکت کرنے لگے تھے۔ چہرے پہ ایک عجیب سا تاثر تھا۔ دماغ اب بالکل شانت تھا۔ وہ طوفان جو پچھلی شب سے اس کے دماغ کو مفلوج کیے ہوئے تھا، وہ جیسے تھم سا گیا تھا۔ کسی نے ہتھیلی سے ساری دھند کو صاف کر ڈالا تھا اور صاف کرنے کے بعد اب جو تعارف خدا کا اس کے سامنے آیا تھا، وہ ہر دوسری شے پر غالب تھا۔

☆☆☆

اس کا میٹرک ختم ہوا تو اس نے ایک اچھے سے پرائیویٹ وومن کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔۔۔ ہاں اس اسکول کے اختتام اور کالج کی ابتداء کے دوران کچھ ایسے واقعات پیش آئے تھے، جو اس پر بہت بھاری بن کر ٹوٹے تھے۔۔۔ پھر بھی، جیسے تیسے کر کے اس نے خود کو سنبھال کر کھڑا کر لیا تھا۔

اس کے چہرے پر اب ہمہ وقت ایک افسردگی چھائی رہتی تھی۔ چہرے کی وہ رونق جو بچپن میں اس کا خاصہ تھی، اب وہ کہیں کھو گئی تھی۔ وہ اب ویران سی ہو گئی تھی۔ ایک خاموشی اور سناٹا سا

تھا جس نے ایمان زاویار کو گھیر لیا تھا۔ وہ مونی نہیں رہی تھی۔ مونی والے دنوں کو اس نے خوب سخت دل کر کے خیر باد کہہ دیا تھا۔

میر و اس کی واحد دوست تھی۔ اس کے بابا کی اسلام آباد پوسٹنگ ہوئی تو وہ بھی اسلام آباد چلی گئی۔ ایسے ہی یک دن کی بات ہے کہ وہ خاموش سی اپنے بستر پر اوندھے منہ لیٹی تھی کہ زور سے دروازہ کھٹکھٹا کر کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ وہ یکدم ہی سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ سامنے ہی حواس باختہ سی فاطمہ کھڑی تھی۔ اب سے کچھ چھوٹی۔

"کیا ہوا، فاطمہ؟"، اس کی پریشانی فطری تھی۔ وہ تو ویسے بھی بہت جلد ہی پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ اوپر سے فاطمہ کے چہرے کے تاثرات بہت کچھ غلط ہونے کا عندیہ دے رہے تھے۔

"کاکا بھائی کو ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال لے کر گئے ہیں، ایمان۔"

ایمان ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھ کر فاطمہ کے قریب آئی تھی۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھی تھی۔ نجانے کہاں سے ڈھیر سارے آنسو آنکھوں میں امڈ آئے تھے۔

"ک۔۔۔ کیوں؟"، ذہن میں ایک سرخ سگنل جل بجھ ہو رہا تھا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ وہ کیوں گیا ہے ایمبولینس میں، مگر قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"پتا نہیں کیوں۔"، فاطمہ نے لاعلمی ظاہر کی تو ایمان اگلے ہی پل دوپٹہ سر پر لے کر شانوں پہ پھیلاتی باہر کی اور بھاگی تھی۔ ابھی وہ صحن میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ اس کا تصادم باہر سے آتے زرار سے ہوا تھا۔ وہ شاید آفس سے واپس لوٹا تھا۔ اسے اس طرح حواس باختہ دیکھ کر ٹھہر سا گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے، ایمان؟"، اس نے اس کو بازو سے تھام کر سیدھا کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ اور پھر ایک نظر اس کے پیچھے ہی آتی فاطمہ کو دیکھا تھا۔ دونوں کے ہی چہروں کی رنگت متغیر ہوئی ہوئی تھی۔

"موصوفہ کے 'دوست' کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔"، پیچھے سے ایک سخت سی طنز کرتی آواز ابھری تو زرار نے حیرانگی سے سوال آنکھوں میں لیے اسے دیکھا۔ ایمان نے ایک گہرا سانس لے کر چہرہ موڑ کر شانزے کو دیکھا تھا، جو بازوؤں میں ایمن کو بھرے، اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ایک

ابرو طنزیہ انداز میں اٹھا رکھی تھی۔

"کاکا کو ہسپتال لے کر گئے ہیں، بھائی۔ میں دیکھنے جا رہی ہوں کہ معاملہ کیا ہوا ہے آخر۔"، اس نے چہرہ سیدھ میں کرتے ہوئے سنجیدگی سے زرار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا تھا۔

ابھی زرار اس کی بات سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ شانزے کی زبان نے پھر سے زہر اگلا تھا۔

"اتنی بے غیرت اور بے خوف کہ بھائی کے سامنے اپنے 'دوست' کا ذکر کس بے خوفی سے کر رہی ہو۔ توبہ ہے بھئی۔"، دوست پہ خاصا زور دے کر اس نے سر افسوس کے سے انداز میں جھٹکا تھا۔ فاطمہ نے لب بھینچے تھے۔ ابھی وہ کچھ کہہ ہی رہی تھی کہ ایمان پہلے ہی بول پڑی تھی۔۔۔

"کم از کم 'آپ' پہ تو یہ بات ہرگز سوٹ نہیں کرتی، بھابھی۔"، خاصا جتا کر اطمینان سے کہتی ہوئی وہ جھٹ سے باہر کی اور بھاگ گئی تھی جبکہ پیچھے زرار تو زرار، شانزے بھی ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔ اگلے ہی پل وہ غصّے سے سرخ ہوئی تھی اور لب بھینچ کر پیر پٹختی کمرے میں چلی گئی تھی۔ کچھ پل تو زرار بے یقینی سے کھڑا رہا، پھر سر جھٹکتا ہوا وہ بھی کمرے میں چلا گیا۔ اب اپنی

بیوی کو منانا بھی تو تھا ناں!

☆☆☆

"کچھ پتا نہیں چل رہا کہ کاکا کو کیا ہوا ہے۔۔۔ کس سے پتا کروں میں؟"، وہ پریشانی سے کمرے میں یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں ٹہلتی، انگلی لبوں میں دبائے ہوئے تھی۔ وہ ابھی باہر کا معائنہ کر کے آئی تھی مگر گلی میں ایک رش سا لگا تھا۔ کاکا یا اس کے والدین یا گھر والوں میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ ایمان نے ایک سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے فاطمہ کو دیکھا تھا۔ وہ سامنے ہی پلنگ پر بیٹھی اسے ٹہلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ایمان کو ٹیوشن چھوڑے ایک سال ہونے کو آیا تھا اور اس تمام عرصے میں اس کی پھر کبھی ان اچھے دنوں کے ساتھیوں سے کوئی ملاقات یا بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

پھر بھی آج کاکا کی طبیعت خرابی کی خبر سنتے ہی فوراً اس کی آنکھوں کے آگے تمام خوبصورت دن گردش کرنے لگے تھے۔ وہ لوگ بہت حسین یادوں کے ساتھی تھے۔ حسین دن ختم ہو گئے

تھے، مگر یادیں تو ہمیشہ رہتی ہیں ناں!

"آپی، یوں کیوں نہیں کرتی کہ جا کر روحان بھائی یا رضا بھائی سے کچھ پوچھ آؤ۔ ان کو ضرور کچھ نا کچھ خبر ہو گی۔"، جبھی فاطمہ نے سر اٹھا کر پرسوچ انداز میں کہا تو ایمان ٹھہر سی گئی۔ ہاں وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ رضا اور روحان کو ضرور کچھ نا کچھ پتا ہو گا۔

"ہاں مگر میں ان کے پاس جا کر پوچھوں کیا؟"، اس نے پریشانی سے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"فاطمہ، تم جا کر پوچھ آؤ ناں، پلیز۔"، اس نے یکدم ہی سیدھا ہوتے ہوئے امید سے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو فاطمہ نے فورا سے پہلے گردن نفی میں ہلائی اور ہاتھ اٹھاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے تو معاف رکھو، آپی۔ میں ابھی تک رضا بھائی کی ڈانٹ بھولی نہیں ہوں۔ یاد نہیں؟ انہوں نے کیسے مجھے رخسار آپا کی شادی میں ڈانٹا تھا۔ وہ بھی صرف بغیر دوپٹے کے گھر سے نکلنے پر۔۔۔ نہ بابا نہ۔ ناٹ می۔"، وہ قطعیت سے سر نفی میں ہلا رہی تھی۔ ایمان نے ایک گہرا سانس خارج کیا تھا اور اسے نگاہیں پھیر کر دیکھا تھا۔

"دیکھو اس وقت تو غلطی تمہاری ہی تھی۔ ورنہ وہ فضول میں ڈانٹنے والا انسان تو ہے نہیں۔ باہر گلی میں سارے لڑکے کھڑے تھے، اور تم بھی کوئی اتنی چھوٹی نہ تھی۔۔۔"، ایمان چلتی ہوئی آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔ پھر سر اٹھا کر فاطمہ کو دیکھا تھا جو پھر سے آ بیٹھی تھی۔

"چلی جاؤناں، فاطمہ۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نجانے کیسا ہوگا کاکا؟ کیا ہوا ہوگا اسے؟"

"یار آپی۔ میں تمہارے ساتھ تو ان کے پاس جا سکتی ہوں۔۔۔ مگر بات تم ہی کرنا ان سے۔"

"اچھا بھئی۔۔۔ چلو پھر۔"

☆☆☆

باہر گلی میں کاکا کے گھر کے عین سامنے خاصا رش جمع تھا۔ ایمان فاطمہ کے ساتھ وہاں پہنچی تو ٹھہر سی گئی۔ اس بھیڑ میں اسے روحان یا رضا میں سے کوئی بھی نہیں دکھ رہا تھا۔ آس پاس نگاہیں دوڑائیں، گھر کے اندر بھی جھانکا، مگر دونوں میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ آخر کار افسردگی سے وہ پلٹ گئی تھی۔

ابھی اس نے چند ہی قدم آگے بڑھائے تھے کہ کسی سے اس کا زوردار تصادم ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گری تھی۔ فاطمہ فوراً ہی اس کی جانب جھک کر اسے اٹھانے لگی تھی۔ ایمان کی ہتھیلی پہ اچھی خاصی چوٹ آئی تھی اور ان گلیوں کی ہڈّیاں بھی چٹخی تھیں۔ فاطمہ کا ہاتھ تھام کر ابھی وہ بمشکل اٹھی ہی تھی کہ اس کی سماعتوں سے لوگوں کے ہنسنے کی آوازیں ٹکرائی تھیں۔

چہرہ موڑ کر دیکھا تو سامنے نکڑ پر بیٹھے لڑکے قہقہے لگا کر، تالیاں مار کر، اس کی جانب اشارے کر کر کے ہنس رہے تھے۔ ایمان نے خفت سے سرخ پڑتے چہرے کو موڑ کر آگے بڑھنا چاہا تھا جب ایک بار پھر اس کا توازن بگڑا اور وہ لڑکھڑائی، لیکن اس بار اس کے گرنے سے پہلے ہی کسی نے اس کو بازو سے تھام کر گرنے سے روکا تھا۔

وہ ارتضیٰ مراد تھا، جو چہرہ اس پر جھکائے تفکر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایمان نے سن پڑتے دماغ کے ساتھ اسے دیکھا تھا اور پھر اپنے بازو کو تھامے رضا کے ہاتھ کو۔۔۔ اور پھر اگلے ہی پل اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑوایا تھا۔ خفت بڑھ گئی تھی۔ آنکھیں آنسو بہانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔

"ریلیکس ایمان۔ "، ان دونوں کے بیچ یہ ایمان، ارتضی والا تکلف کبھی آڑے نہیں آیا تھا۔ وہ کرائم پارٹنرز رہے تھے۔۔۔ مگر اس لمحہ بیچ میں ایک سال حائل ہو گیا تھا۔ اجنبیت کی ایک دیوار تھی جو جم کر بیچ میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور فی الوقت اس دیوار کو پھلانگنے کا ان دونوں کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

جبھی ارتضی نے چہرہ موڑ کر پیچھے ہنستے لوفر لفنگوں کو دیکھا تھا اور یکدم ہی اس کی شہد رنگ آنکھوں میں ایک انجانی سی سرخی ابھری تھی۔ لب خود بخود ہی سختی سے آپس میں پیوست ہو گئے تھے۔ لہجہ خود بخود ہی سرد سا ہو گیا تھا۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اس کا انداز سرد سا تھا۔ سنجیدہ سخت سا۔ فاطمہ کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھری تھی۔ اس نے تو نگاہیں جھکا ہی دی تھیں۔ ارتضی نے ایک نظر ایمان کو، اور ایک نظر فاطمہ کو دیکھا تھا۔ ایمان فاطمہ کے برعکس رضا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔

"کاکا کا پوچھنے آئے تھے۔"، اس نے سنجیدگی سے رضا کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔ جبھی اس کی نظر رضا کے پیچھے کھڑے روحان پر پڑی تھی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سوال واضح تھا۔

"کس سے؟"، رضا کا لہجہ دہکنے لگا تھا۔ آنکھیں سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھیں۔

"تم سے۔"، ایمان کا جواب اتنا ہی سیدھا تھا جتنا ٹیڑھا رضا کا سوال تھا۔ رضا نے نا سمجھی سے بھنویں سکیڑی تھیں۔

"مجھ سے؟"، اسے جیسے سمجھ نہ آیا تھا۔

"تم دونوں سے۔"، ایمان نے جتا کر جواب دیا تھا۔ اس کا لہجہ اب بھی ویسا ہی سنجیدہ سا تھا۔

"ہسپتال میں ہے وہ۔"، اب کی بار روحان آگے آیا تھا اور سنجیدگی سے اسے بتایا تھا۔ اس کا جواب سن کر یکدم ہی ایمان کی آنکھوں میں تفکر ابھرا تھا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے اسے؟"، وہ ایک قدم ان دونوں کے قریب آئی تھی۔ فاطمہ نے بھی جھکا سر

اٹھا کر ان دونوں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"کینسر تھا اسے۔۔۔ آٹھ سالوں سے۔"، اور ایمان کا حلق تک اس بات پر سوکھ گیا تھا۔ اس نے بے یقینی سے روحان کو دیکھا تھا، جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کیا؟ کک۔۔۔ کیا کہا تم نے؟"، وہ بے یقینی سے کہتی ایک قدم مزید قریب آئی تھی۔ آنکھوں میں ایک انجانا سا خوف ہلکورے لے رہا تھا۔

"جو تم نے سنا۔"، اب کی بار رضا نے خاصی سنجیدگی سے اسے دیکھ کر جواب دیا تھا۔ ایمان کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ یہ فکر فطری تھی۔ وہ اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اس کے اچھے برے وقتوں کا ساتھی۔ برے وقتوں کے ساتھیوں کو اچھے وقتوں میں نہیں بھولنا چاہیے۔ اور ایمان زاویار تو یوں بھی بھلا دینے والوں میں سے نہیں تھی۔

"مگر۔۔۔"، ابھی وہ مزید کچھ کہتی ہی کہ رضا نے اس کی بات بیچ میں کاٹی تھی۔

"پتا چل گیا ناں؟ ناؤ گو۔"، اس کے لہجے میں عجیب سرد پن سا تھا۔ ایمان نے اسے نا سمجھی سے دیکھا تھا۔ وہ اتنی سختی سے کیوں پیش آ رہا تھا؟ یہ بات آرام سے بھی کہی جا سکتی تھی۔

"ایمان۔۔۔ جاؤ۔"، اب کی بار روحان نے بھی آگے بڑھ کر کچھ نرمی سے اس سے کہا تھا۔

ایمان نے لب بھینچے تھے۔

"کیوں؟ کیا مسئلہ ہے؟"، اس کے لہجے میں ضدّی پن تھا۔ بازو سینے پہ لپیٹ لیے تھے۔ آنکھیں ان دونوں پر ہی ٹکی تھیں۔

"ایمان، تم میری بہن ہو۔۔۔ آئی کانٹ ٹولیریٹ کہ کوئی تم پر غلط نظر ڈالے۔"، اب کی بار روحان نے خاصے نرم لہجے میں اسے کچھ باور کروایا تھا۔ بے ساختہ ہی ایمان نے چہرہ پھیر کر نکڑ پر بیٹھے لڑکوں کو دیکھا تھا جو اس کے اپنی جانب دیکھتے ہی ہوٹنگ کرنے لگے تھے۔ پھر اس نے چہرہ موڑ کر رضا کو دیکھا تھا۔ رضا کا چہرہ اس حد تک سنجیدہ تھا کہ اس کو اپنے وجود میں ایک سنسنی خیز لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

"چلو، فاطمہ۔"، فاطمہ کا ہاتھ تھام کر ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ نکڑ پہ بیٹھے لڑکوں میں سے دو اٹھ کر اس تک آئے تھے اور اس کے سامنے حائل ہو کر اس کا راستہ روکا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے رکی تھی اور انہیں دیکھا تھا۔ فاطمہ یکدم ہی اس کے پیچھے ہو گئی تھی اور حراساں

نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"زاویار صاحب کی صاحبزادی راہ چلتے لڑکوں سے راز و نیاز بھی کرتی ہے؟"، ان میں سے ایک خاصا جتا کر زہر خند لہجے میں غلاظت سے بولا تھا۔ ابھی ایمان کچھ کہتی ہی کہ کوئی تیزی سے چلتا اس کے پیچھے سے اس کے آگے آیا تھا اور عین اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا، یوں کہ وہ اور فاطمہ اس کی پشت پر چھپ گئی تھیں۔

اگلے ہی پل اس نے ایک مکّہ زور سے اسی لڑکے کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ وہ لڑکا بلبلا کر چیخ پڑا تھا۔ ایمان نے خوف سے روحان کو دیکھا تھا۔ وہ بھی چلتا ہوا ان دونوں کے سامنے ہی آ کھڑا ہوا تھا۔ نکڑ پر بیٹھے سارے لڑکے اٹھ کر ادھر ہی آ گئے تھے۔ ان دونوں لڑکوں کی گردنیں ان دونوں کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مار رہے تھے۔

باقی سب انہیں چھڑانے لگے تھے۔ وہ دونوں کھڑی حراساں نظروں سے سب دیکھ رہی تھیں۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ اور کیوں ہو رہا تھا؟ ان کا دماغ کچھ بھی جذب کرنے سے قاصر تھا۔ لڑکوں نے بیچ

بچاؤ کروایا تو ہاتھ جھاڑتے ہوئے روحان پیچھے ہوا تھا۔ ساتھ رضا کا بازو پکڑ کر اسے بھی پیچھے کیا تھا۔

"یہ میری بہن ہے۔ آئی بات سمجھ؟"، وہ گرجا تھا۔ اس بری طرح کہ وہ لڑکے فوراً ہی سر زوروں سے اثبات میں ہلانے لگے تھے۔ رضا کی آنکھیں تو اب بھی خون چھلکا رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہیں اب بھی نہ چھوڑے۔۔۔ پھر بھی رک گیا۔ ایک نظر ان لڑکوں کو خونخواری سے دیکھ کر اپنے بازو سے روحان کا ہاتھ جھٹکا اور مڑ کر ان دونوں کو دیکھا جو ساکت کھڑی تھیں۔

اس کی آنکھوں میں اتنی سختی پنہاں تھی کہ ایمان اور فاطمہ کے لیے وہاں مزید ایک بھی منٹ کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ مڑی تھیں اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ ان کے وجود کپکپانے لگے تھے۔ ایسی خون خرابی انہوں نے پہلی بار اتنے قریب سے دیکھی تھی۔ ان کا ڈرنا بنتا تھا۔

یہ دن انہیں ہمیشہ یاد رہنا تھا۔ رضا کی آنکھوں کا وہ تاثر بھی۔ وہ سرد پن بھی۔ وہ سختی بھی۔

☆☆☆

ہسپتال کی وہ طویل سی راہداری سرد پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ رات کا پہلا پہر شروع ہونے کو تھا۔ ایسے میں کراچی میں موجود اس ہسپتال کی راہداری میں رکھی نشستوں میں سے دو پر وہ دونوں بیٹھی تھیں۔ سیاہ عبائے اور نقاب میں ملبوس لڑکی سر جھکائے سست روی سے اپنی گود میں سر رکھ کر لیٹے بچّے کے بال سہلا رہی تھی۔ اسی کے برابر والی نشست پہ کم عمر سی لڑکی بھی بیٹھی تھی۔

ان دونوں کے چہروں پر پریشانی چھائی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ ان سے کچھ ہی فاصلے پر ایک آدمی سر جھکائے، بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ انہیں یہاں آئے ابھی تھوڑا ہی وقت ہوا تھا۔ جبھی دروازہ کھولا گیا تو وہ سب ہی وہاں متوجہ ہوئے۔ غزل ارحم کا سر نشست پر رکھتی اٹھی تھی۔ کمرے سے ایک نوجوان ڈاکٹر کے ساتھ دو ادھیڑ عمر نرسیں بھی باہر آئی تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب۔ وہ کیسی ہے؟"، ثمرین نے آگے بڑھ کر پریشانی سے استفسار کیا تھا۔ غزل اور

بہادر بھائی بھی ڈاکٹر کے بولنے کے ہی منتظر کھڑے تھے۔ ان تینوں کو دیکھ کر ڈاکٹر نے چہرہ سیدھ میں رکھ کر نہایت پیشہ ورانہ میں انہیں مخاطب کیا تھا۔

"انہیں بظاہر تو ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ آئی مین کوئی چوٹ وغیرہ نہیں ہے۔ انہوں نے کوئی گہرا اسٹریس لیا ہے، جس کی وجہ سے پینک کر کے وہ ہوش کھو بیٹھیں۔ باقی، ابھی ان کو ہم نے گلوکوز کی ڈرپ لگا دی ہے۔ کیونکہ انہیں کمزوری بھی بہت ہے۔ جیسے ہی ہوش آتا ہے، آپ ان سے مل سکتے ہیں۔ یہ دوائیں بھی ارینج کر دیں۔"، وہ ڈاکٹر کہتے ہوئے خفیف سا سر جھکا کر اسٹیتھوسکوپ گلے میں ڈالتا ہوا چلا گیا تھا۔ نرس نے ثمرین کے ہاتھ میں دواؤں کی پرچی تھمائی اور پھر وہ دونوں نرسیں بھی اس کے ساتھ ہی پیچھے پیچھے گئی تھیں۔

غزل نے ایک گہرا سانس خارج کر کے پاس کھڑی ثمرین کو دیکھا تھا۔

"پتا نہیں کون ہے یہ، باجی۔۔۔ اس کے گھر والوں کو اطلاع کر دیتے ہیں تاکہ وہ آئیں تو ہم جائیں گھر۔"، ثمرین نے سمجھداری سے کہا تو غزل نے بھی متفق ہو کر سر ہلایا۔ اور چہرہ موڑ کر بہادر بھائی کو دیکھا۔ اس کے دیکھتے ہی بہادر بھائی نے فوراً سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔

اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس میں اس لڑکی کا موبائل تھا جو اسی جگہ سے ملا تھا۔ مگر اس موبائل کی حالت دیکھ کر ان سب کے چہروں پر ایک تکان سی ابھری تھی۔ موبائل کی اسکرین چکنا چور ہوئی ہوئی تھی۔ شاید جب موبائل زمین پر گرا تو کوئی اس پر جوتے سمیت چڑھ گیا تھا۔

"اب کیا کریں؟"، ثمرین نے تفکر سے غزل کی اور دیکھا تو غزل نے لاعلمی سے شانے اچکائے اور پھر سے نشست پر بیٹھ گئی۔ پھر یونہی چہرہ اٹھا کر بہادر بھائی کو دیکھا۔

"بہادر بھائی، اس میں سے سم نکالیں۔"

بہادر صاحب نے مستعدی سے موبائل کو کھنگالا اور ایک جانب سے سم نکالی۔ پھر غزل کو ایک نظر دیکھ کر اپنا موبائل جیب سے نکال کر اس میں سم ڈالی۔ کچھ پلوں بعد سم کی تمام ڈیٹیلز موبائل میں لوڈ ہوئیں تو انہوں نے موبائل غزل کی جانب بڑھایا۔ چند پلوں بعد غزل ایک نمبر ڈائل کیے، فون کان سے لگائے بیٹھی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

اگلی جانب گھنٹیاں جاتی جا رہی تھیں مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ وہ لب دانتوں تلے دبائے اپنے گھٹنے پہ دھرے اپنے ہاتھ اور ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔ جبھی یکدم ہی اگلی جانب سے فون اٹھا لیا

گیا تو اس نے چہرہ سیدھا کیا۔

"ہیلو؟"، اگلی جانب سے ایک بے قراری میں ڈوبی نسوانی آواز ابھری تھی۔ غزل کو اس آواز میں نمی بھی گھلی محسوس ہوئی تھی۔

"ہیلو ایمان؟ تم ٹھیک ہو؟"، اگلی جانب سے ایک بار پھر بولا گیا تھا۔ غزل سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"ہیلو۔۔۔ میں غزل رمیص بات کر رہی ہوں۔۔۔"، ابھی وہ مزید کچھ بولتی ہی کہ اگلی جانب جیسے ایک حیرت بھری خاموشی چھا گئی تھی۔

"کون غزل؟"، وہاں محض نا سمجھی تھی۔

"ایکچوئلی اس موبائل کی اونر جو ہیں، وہ ہسپتال میں ہیں۔۔۔"،

"کیا؟ کیا ہوا ہے ایمان کو؟"، اگلی جانب سے ایک بار پھر بات تیزی سے کاٹی گئی تھی۔ غزل نے ضبط سے آنکھیں بند کر کے کھولی تھیں اور ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کیا تھا۔

"دیکھیں آپ تحمّل سے میری پوری بات سنیں پہلے۔"، نہایت شائستگی اور نرمی سے اس نے

کہا تو اگلی جانب مقابل نے جیسے سر ہلایا تھا۔

"جی، کہیے آپ!"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس پینک کر گئی تھیں اور بے ہوش ہو گئی تھیں۔ آپ پلیز سول ہسپتال آ جائیں تاکہ ہم اپنے گھر جا سکیں۔"، غزل نے نہایت نرمی سے کہا تو اگلی جانب فاطمہ نے اندر ہی اندر بہت سے آنسو اتارے تھے۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ یکدم ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اپنے کمرے میں کھڑی وہ ڈھے جانے کے سے انداز میں وہیں فرش پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"یا اللہ! تیرا شکر ہے، میرے اللہ! تیرا بہت شکر ہے۔"، بہتے آنسوؤں کے درمیان وہ سسکیوں اور ہچکیوں سمیت بول رہی تھی۔ غزل کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ کون تھی اور ایسے کیوں رو رہی تھی؟

"ارے آپ کو کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہیں؟"، اس نے پریشان نظروں سے ثمرین اور بہادر

بھائی کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں بھی آنکھوں میں ڈھیروں ناسمجھی لیے اسے ہی سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"نہیں، بس کچھ نہیں۔"، فاطمہ نے ہاتھ کی پشت سے بھیگا چہرہ صاف کیا اور ایک نم سانس خارج کیا۔

"ایمان ہوش میں آگئی ہے تو آپ میری اس سے بات کروا سکتی ہیں؟"، فاطمہ نے اب کے لہجے کو خاصا کمپوز کر کے سوال کیا تو غزل نے سر نفی میں ہلا یا۔

"ابھی وہ ہوش میں نہیں آئی ہیں۔ جیسے ہی آتی ہیں، میں ان کی بات کروا دوں گی آپ سے۔ مگر آپ پلیز یہاں آجائیں۔"، غزل نے اب کے چہرہ موڑ کر سوتے ہوئے ارحم کو دیکھا تھا۔ وہ بیچارہ پورے دن سے بیزار اور تھکا ہوا تھا۔

"دیکھیں آپ میری بات تحمّل سے سنیے گا۔۔۔ اور جو میں آپ سے کہنے لگی ہوں، اس کو سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔"، فاطمہ نے اب کے بات کا آغاز کافی سمجھداری اور شائستگی سے کیا تھا۔ البتہ

لہجے میں اب بھی نمی واضح گھلی محسوس ہوتی تھی۔

"ہم کراچی میں نہیں رہتے ہیں۔ ہمارا سارا کنبہ حیدر آباد میں موجود ہے۔ میری بہن، ایمان کراچی میں اکیلی ہے۔"، فاطمہ جوں جوں کہتی جا رہی تھی، غزل کی آنکھوں میں حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیسا ری ایکشن دینا چاہیئے۔ کیا کہنا چاہیئے؟ کیا کرنا چاہیئے؟

"وہ وہاں آج ہی پہنچی ہے۔ ہمارا گھر تھا ایک کراچی میں جو ہمارے بھائی نے ہمیں بتائے بغیر ہی بیچ دیا ہے۔ اب وہ بے آسرا ہے وہاں۔۔۔ اس کے بیگ میں کچھ پیسے ہیں۔ آپ سے ہو سکے تو ان پیسوں سے اسے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیں۔ ہم سب آپ کے بے حد مشکور ہوں گے۔"، فاطمہ کا انداز نہایت سلجھا ہوا تھا۔ وہ تو یوں بھی بات کرنے میں ماہر تھی۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے الفاظ اس فن سے ادا کرنے میں ماہر ہوتے ہیں کہ سامنے والا ان کی بات اچھے سے سمجھ جاتا ہے اور مان بھی جاتا ہے۔ فاطمہ زاویار احمد ان لوگوں میں سے ہی ایک تھی۔

"اچھا اوکے۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں کرتی ہوں کچھ۔ خدا حافظ۔"، غزل نے تحمل اور اپنی ازلی

نرمی سے جواب دیا اور اگلی جانب سے خدا حافظ سننے کے بعد فون کاٹ کر بہادر بھائی کی جانب موبائل بڑھایا۔

"کیا ہوا، باجی؟"، ثمرین بے صبری سے کہتی اس کے برابر میں آ بیٹھی تھی۔ غزل نے ایک گہرا سانس لے کر اسے چہرہ موڑ کر دیکھا تھا۔

"یہ لڑکی کراچی میں اکیلی ہے۔ اس کے تمام گھر والے حیدر آباد میں رہتے ہیں۔۔۔ اس کی بہن نے کہا ہے کہ اس کو یہیں کوئی محفوظ مقام میسر کر دوں۔"، وہ سنجیدگی سے عام سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ بہادر بھائی نے آنکھیں سکیڑی تھیں اور اس کے قریب آئے تھے۔

"مطلب کہ ہم اس کے لیے کوئی محفوظ مقام ڈھونڈیں؟ مگر کیوں؟"، وہ جیسے خاصی ناسمجھی سے اپنے سینے پہ انگلی رکھے پوچھ رہے تھے۔ ان کے انداز میں جھنجھلاہٹ بھی صاف واضح تھی۔ دوسرے کا بوجھ اپنی جان پہ ہمیشہ زیادہ ہی لگتا ہے۔

"بہادر بھائی۔ ثمرین۔"، غزل نے باری باری دونوں کو مخاطب کیا تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل سنجیدہ تھیں۔ جیسے وہ کافی سوچ بچار کے بعد کسی نہج پر پہنچ چکی ہو۔

"جہاں تک میں اس کی بہن سے بات کر کے سمجھی ہوں، یہ لڑکی یہاں کسی وجہ سے آئی ہے۔ شاید اپنے گھر سے بھاگ کر۔"، ثمرین کی آنکھیں گول ہوئی تھیں۔ اس نے لب دانتوں تلے دبایا تھا۔ بہادر بھائی بھی محتاط انداز میں ایک قدم قریب آئے تھے۔ "اس کی بہن نے مجھ سے کہا ہے کہ یہیں کہیں اسے کسی محفوظ جگہ پہ پہنچادوں۔۔۔ اس کے پاس پیسے بھی ہیں۔۔۔ مگر بات یہ ہے کہ ایک رات میں تو اس کے لیے گھر ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گا۔"، وہ پرسوچ انداز میں کہتی جارہی تھی۔

"کسی ہوٹل میں بھی تو ٹھہرا سکتے ہیں۔"، ثمرین کے کہنے پر غزل نے اتفاق کرنے کے سے انداز میں سر ہلایا تھا۔

"پہلے اسے ہوش آجائے، پھر دیکھتے ہیں۔ کرتے ہیں کچھ۔"، وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی تھی اور ثمرین کی جانب مڑی تھی۔

"میں اندر جارہی ہوں۔ تم ارحم کے پاس ہی رہنا۔۔۔"، اور پھر وہ بہادر بھائی کی جانب مڑی۔

"بہادر بھائی، آپ ڈاکٹر کی دی گئی پرچی لے جائیں اور دوائیں لے آئیں۔"

اور اس نے قدم اندر کی جانب بڑھا دیئے تھے۔

☆☆☆

ہسپتال کے بیڈ پر لیٹی وہ کافی پژمردہ سی لگتی تھی۔ پورے دن سے رو رو کر اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے ہو گئے تھے۔ لب سوکھے ہوئے لگتے تھے۔ اس کا عبایہ ساتھ ہی رکھی بنچ پر پڑا تھا۔ اسٹینڈ پر لٹکی ڈرپ کا سفید مائع قطرہ بہ قطرہ سوئی کے ذریعے اس کے جسم میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

غزل ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئی تھی۔ ایک نظر اس کو دیکھ کر اس نے مڑ کر دروازہ بند کیا تھا اور چلتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ کونے میں پڑی کرسی اٹھا کر اس نے پلنگ کے برابر میں رکھی اور نقاب کھولتے ہوئے اس پر بیٹھ گئی۔ نظریں اس کم سن سی لڑکی کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

اس نے اس کا چہرہ اب دیکھا تھا۔ بند آنکھوں سے لیٹی وہ سپاٹ سی لگتی تھی۔ مگر نہیں۔۔۔ اس

کی آنکھیں بری طرح سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے پر سوکھے آنسوؤں کے نشانات صاف واضح تھے۔ لب سوکھ کر کھلے ہوئے تھے۔ غزل کو ایک پل کے لیے نجانے کیوں اس پر بہت ترس آیا تھا۔

شاید یہ لڑکی بھی اسی کی طرح دکھوں اور اذیتوں میں گھری ہوئی تھی!

شاید وہ بھی تنہائیوں کو جھیلتی اکیلی کبھی کبھی کمزور پڑ جایا کرتی ہو گی!

اور پھر، جب برداشت جواب دے جاتی ہو گی، تو وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی ہو گی!

کیا اس دنیا میں کوئی ایک بھی شخص ایسا ہے جس کی زندگی میں کوئی مسائل نہ ہوں؟

جس کی زندگی بالکل کسی پرفیکٹ سی فیری ٹیل کی مانند ہو؟

جس کی آنکھیں اور دل ہمہ وقت مسکراتے رہتے ہوں؟

جس کی خوشیاں دائمی ہوں؟

برے وقت جس نے نہ دیکھے ہوں؟

شاید نہیں!

کیونکہ زندگی ایک ایسی راہ گزر ہے جس پہ محض کنکر ہی کنکر، پتھر ہی پتھر، ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہیں۔ ایک ٹھوکر کھا کر جو چند قدم ہم آرام سے چل لیتے ہیں، انہیں ہم دائمی سکون سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے میں یہ بات فراموش کر جاتے ہیں کہ یہ ایک پتھریلی راہ گزر ہے۔ پتھر اور کنکر ہر کچھ قدموں پر منتظر کھڑے ہیں۔

راہی ٹھوکر کھائے گا۔ لڑکھڑا کر گر جائے گا۔ زخمی ہو کر بلبلائے گا۔ پھر آنسو پونچ ڈالے گا۔ اور پھر سے کھڑا ہو جائے گا۔ قدم پھر سے آگے بڑھائے گا۔ کیونکہ یہ راہگزر ہی ایسی ہے کہ آگے بڑھتے جاؤ گے تو پچھلا راستہ مٹتا جائے گا۔ آپشن صرف ایک ہو گا۔ اور وہ ہو گا آگے ہی آگے بڑھنا۔ پیچھے مڑ کر جانے کا تو کوئی آپشن موجود ہی نہیں ہو گا۔

غزل کی آنکھوں میں نمی جھلملائی تھی۔ وہ نم پڑتی آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھے گئی تھی جس کی

پلکوں میں اسے یکدم ہی ہلکی سی لرزش ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سیدھی ہو کر کچھ قریب ہوئی تھی۔ اب وہ لڑکی دھیرے دھیرے اپنی پلکیں جدا کر رہی تھی۔ اس کے لب پھڑپھڑا رہے تھے۔ ڈرپ والے ہاتھ کی انگلیاں حرکت کر رہی تھیں۔

بمشکل بھاری ہوتے سر کے ساتھ اس نے پلکیں جدا کیں اور ایک گہرا تکلیف دہ سانس خارج کیا۔ پھر یونہی نظریں پھیریں تو اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر وہ ٹھہر سی گئی۔ پتلیاں بھی ٹھہری تھیں۔ اتنا مکمل حسن اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اتنی خوبصورت تو فاطمہ بھی نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کی امی۔

اگلے ہی پل وہ کہنی بستر سے ٹکائے اٹھنے لگی تو غزل نے آگے بڑھ کر اس کا ڈرپ والا ہاتھ تھاما۔

"اونہوں۔ لیٹی رہو۔"، نرمی سے اسے کہہ کر غزل نے شانوں سے پکڑ کر پھر سے لٹایا تھا۔

ایمان حیرت سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ کون تھی یہ؟ اور وہ خود کہاں تھی؟ اس کے سر کی پچھلی طرف درد کی ٹیسیں سی اٹھی تھیں۔ اس نے بے اختیار ہی درد سے آنکھیں میچی تھیں۔

"کیسی ہو اب؟"، غزل نرمی سے ذرا سا جھک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ایمان نے

آنکھوں میں بے پناہ حیرت لیے اسے دیکھا تھا۔ ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی تو گزری شام کسی کنیچے کی مانند آنکھوں کے سامنے گھوم کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں اب کے پوری طرح سے کھل گئی تھیں۔ ذہن بھی جیسے کسی خواب سے جاگ اٹھا تھا۔

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔ کون ہیں؟"، رک رک کر خوفزدہ نظروں سے غزل کو دیکھتے ہوئے اس نے سوال کیا تھا۔ غزل نرمی سے مسکرائی تھی۔ پھر ہنوز مسکراتے ہوئے ذرا اور جھکی تھی۔

"میں غزل ہوں۔۔۔ غزل رمیص۔ اور تم ایمان ہو۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔"، اسی نرمی سے غزل مسکراتے ہوئے بولی تو ایمان کی آنکھیں پھیلیں۔ سوکھے لب خود بخود ہی جدا ہو گئے۔ اس نے خاصی حیرت سے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ یہ نام اس نے پہلے سن رکھا تھا۔۔۔ کہاں سنا تھا؟ یہ یاد کرنے کی کوشش جو نہی کی، تو ٹیسیں بڑھتی محسوس ہوئیں۔ اس نے بے اختیار ہی آنکھیں میچی تھیں۔

"تم بے ہوش ہو گئی تھیں سو ہم تمہیں یہاں لے آئے۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

ایمان اس نرم خو سی لڑکی کو نجانے کیوں دیکھے گئی۔ اس کی نرمی اسے "کسی" کی نرمی یاد دلا رہی

تھی۔ اس کی آنکھوں میں نجانے کیسے ڈھیر ساری نمی اکٹھی ہونے لگی۔ لب خود بخود ہی بھینچ گئے تھے۔ رخسار سرخ پڑ کر دہکنے لگے تھے۔ کان کی لوئیں تک سرخ پڑنے لگی تھیں۔ دل کسی نے مٹھی میں لے کر بے دردی سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ روح کے زخم ایک بار پھر سے ادھڑتے محسوس ہوئے تھے۔

غزل نے اس کے یہ بدلتے تاثرات، آنکھوں کی یہ نمی، سرخ پڑتا چہرہ بخوبی دیکھا تھا۔۔۔ پھر بھی ایک گہرا سانس لے کر وہ کچھ قریب آئی اور اس کا ڈرپ والا ہاتھ تھاما۔

"میں تمہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر گھر چلی جاؤں گی۔۔۔ تمہاری سم سے تمہاری بہن کو کال کی تھی میں نے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تمہارے پاس پیسے ہیں۔۔۔ تمہارا بیگ باہر میری میڈ کے پاس رکھا ہے۔ اس میں جو سامان اور پیسے ہیں، وہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔ آئی ول مینج۔" وہ دھیمے پن سے نرم انداز میں کہتی جا رہی تھی اور ایمان ڈبڈبائی آنکھوں اور دکھتے گلے کے ساتھ اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ کوئی اس لڑکی کو سمجھائے کہ وہ اتنی نرم نہ ہو۔ اس کے ساتھ اتنی نرمی نہ برتے۔ کیونکہ ایمان زاویار کے ساتھ اتنا نرم صرف ایک ہی شخص تھا۔۔۔ اور وہ۔۔۔ وہ اسے

چھوڑ گیا تھا!

اس نے ایک نم سانس فضا کے سپرد کر کے ڈبڈبائی آنکھوں سے غزل کو دیکھا تھا۔

"آپ اتنی سوفٹ نہ ہوں میرے ساتھ، پلیز۔"، ٹھہر ٹھہر کر اس نے نم لہجے میں دھیرے سے کہا تو غزل، جو بولتی چلی جا رہی تھی، یکدم ہی ٹھہر کر اسے ناسمجھی سے دیکھنے لگی۔

اس کی نرمی پہ پہلی بار کسی نے اسے ٹوکا تھا!

کیا کسی کو نرمی بھی بری لگ سکتی ہے؟

"جی؟"، وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ ایمان نے محض سر نفی میں ہلایا تھا اور ڈرپ والا ہاتھ غزل کے ہاتھ سے نکال کر ہتھیلی سے آنسو پونچے تھے۔ غزل اسے ہمدردی سے تکتی جا رہی تھی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

"مجھے تنہا رہنے دیں۔ مجھے ساتھیوں کی عادت نہیں۔"، اس نے نجانے کس دل سے چہرہ موڑتے ہوئے جواب میں کہا تھا۔ غزل کے دل کو بے ساختہ ہی کچھ ہوا تھا۔

"یعنی تم بھی میری طرح تنہا ہو؟"، اس نے سر جھکاتے ہوئے مدھم آواز میں دھیرے سے پوچھا تو ایمان نے ہولے سے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ غزل کی ہیزل رنگ آنکھوں میں نمی اکٹھی ہونے لگی تھی۔ اسی نمی کو چھپانے کو اس نے چہرہ جھکایا تھا۔

"آپ کی طرح تو نہیں، البتہ تنہا ہی ہوں۔"، اس کا انداز کچھ جتا رہا تھا۔ کچھ بتلا رہا تھا۔ کچھ جھلکا رہا تھا۔ غزل نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"تم حیدر آباد سے یہاں آئی ہو؟ اکیلی ہو؟"، نجانے کیوں اس نے پوچھا تھا۔ ایمان نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"مجھے پتا چلا کہ تمہارے بھائی نے تمہارا گھر بیچ ڈالا۔۔۔"، اس کے لہجے میں افسردگی در آئی تھی۔ ایمان تلخی سے مسکرائی تھی۔

"جی۔۔۔ تنہا تو تھی ہی۔ رہی سہی کسر اس نے پوری کر دی۔"

"تمہاری ڈرپ ختم ہوتی ہے تو کچھ سوچتے ہیں۔۔۔ ریسٹ کرو جب تک تم۔"، غزل بولی تو ایمان نے سمجھ کر سر ہلا دیا اور چہرہ پھر سے موڑ کر آنکھیں موند گئی۔ غزل ایک آخری نظر اسے

دیکھ کر نقاب لگاتی باہر چلی آئی تھی۔ سامنے ہی ثمرین بیٹھی سوئے ہوئے ارحم کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ ارحم کو سائیڈ کرتی وہ فورا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا، باجی؟"، غزل کی آنکھوں میں نمی تھی۔۔۔ ثمرین اچانک ہی پریشان ہو گئی تھی۔ غزل سر نفی میں ہلاتی آکر ارحم کے برابر میں ہی نشست پر براجمان ہو گئی تو ثمرین بھی اس کے برابر میں آ بیٹھی۔ چہرہ موڑ کر اسے تفکر اور پریشانی سے دیکھا۔

"وہ تنہا ہے، ثمرین۔۔۔ وہ تنہا ہے۔"، وہ خود سے کہہ رہی تھی یا ثمرین سے، یہ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی نمی بڑھتی جا رہی تھی۔

لہجے کی لڑکھڑاہٹ بھی واضح محسوس ہوتی تھی۔

اندر چند ہی منٹ تو بتائے تھے اس نے۔

ان چند منٹوں میں ایسا کیا ہوا تھا؟

"باجی؟"، ثمرین کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی، ثمرین کو سمجھ

نہیں آ رہا تھی۔

"وہ بالکل میری ہی طرح تنہا ہے، ثمرین۔ جانتی ہو؟ اسے ساتھیوں کی عادت نہیں۔۔۔ مگر مجھے تھی۔ اب میری یہی عادت مجھ پر بھاری پڑ رہی ہے۔ اس کی طرح اگر میں ہوتی تو شاید میرے لیے اتنی مشکل نہ ہوتی۔۔۔ شاید میرا زخم بھر چکا ہوتا۔۔۔ شاید میری روح کو سکون میسر ہو چکا ہوتا۔۔۔ مگر مجھے تو ساتھیوں کی عادت تھی، ثمرین۔ مجھے ساتھیوں کی عادت تھی۔"، وہ حواس باختگی اور جذباتیت میں نجانے کیا کیا بولتی جا رہی تھی۔ ثمرین نے اسے آگے بڑھ کر خود سے لگا لیا تو وہ ایک جھٹکے سے اس سے دور ہوئی۔ ثمرین خالی بازو ہوا میں معلق کیے حیران بیٹھی رہ گئی تھی۔

"مت بناؤ مجھے ساتھیوں کی عادی۔ مت بناؤ مجھے کاندھوں کی عادی۔ میں خود رو لوں گی۔ مجھے اکیلے رونے کی عادت بنانے دو۔۔۔"، وہ رو نہیں رہی تھی۔ مگر نجانے پھر بھی کیوں، روتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ آواز بھاری تھی۔ مگر پھر بھی وہ رو نہیں رہی تھی۔ ثمرین کو اس پر بہت سا ترس آیا تھا۔ آنکھیں بھر بھر آئی تھیں۔

☆☆☆

زاویار احمد صاحب کے گھر میں سناٹے کا عالم تھا۔ ہر سو ایک خاموشی سی چھائی تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ وہ نیند میں محو تھی جب دروازے پر کسی نے دھیرے سے دستک دی تھی۔ وہ منمناتی ہوئی اٹھی تھی اور چکراتے سر کے ساتھ دھندلی آنکھوں کو مسلتی دروازے تک گئی تھی۔

"کون؟"، خمار آلود آواز میں دھیرے سے پوچھا تو اگلی جانب سے کچھ توقف کے بعد رضیہ بیگم کی دھیمی آواز گونجی۔

"میں ہوں۔"

فاطمہ سیدھی ہوئی تھی۔ اور پھر دروازے کی چٹخنی اتار کر دروازہ وا کیا تھا۔ سامنے ہی سپاٹ سا چہرہ لیے رضیہ بیگم کھڑی تھیں۔ وہی شام والے لباس میں ملبوس وہ تکان زدہ تو لگتی تھیں مگر چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ بے تاثر۔ سپاٹ۔

رضیہ بیگم نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا، اور اگلے ہی پل ان کے سپاٹ چہرہ پر پریشانی ابھری تھی۔ آنکھوں میں تفکر امڈ کر آیا تھا۔ وہ بے ساختہ ہی قریب آئی تھیں۔

"تم روئی ہو؟"، انہوں نے تفکر سے اس کا بازو تھاما اور ایک پریشان نظر اس کی سوجی ہوئی سرخ آنکھوں پر ڈالی۔ فاطمہ لب آپس میں سیے ایک طرف کو ہوئی تو وہ اندر داخل ہو گئیں۔ پیچھے سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھانے کے بعد وہ ان کو لیے پلنگ تک چلی آئی تھی۔ رضیہ بیگم اب بھی تفکر سے اسے دیکھتی جا رہی تھیں۔

"جی۔۔۔ روئی ہوں۔"، ان کو بٹھا کر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے تکان زدہ سی آواز میں جواب دیا تھا۔

"مگر کیوں؟"، وہ تڑپ کر رہ گئی تھیں۔ ایک بیٹی سے دوری اور دوسری بیٹی کی یہ حالت۔۔۔ ان کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

"ایمان سے بات ہوئی تھی میری کافی دیر پہلے۔"، اس نے دھیمے انداز میں آہستہ سے کہا تو رضیہ بیگم بے چینی سے آگے کو ہوئیں اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے نحیف ہاتھوں میں تھام لیے۔

"کیسی ہے وہ؟ بخیریت پہنچ گئی؟"، ان کی ممتا اور ان کی تڑپ ان کے لہجے سے بھل بھل بہہ رہی تھی۔ آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی امڈ آئی تھی۔ فاطمہ نے سر اثبات میں ہلایا تھا اور نرمی سے ان کے ہاتھ کی پشت پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

"پہنچ گئی تھی۔ ٹھیک ہے وہ۔ خیریت سے ہے۔"، اس نے انہیں اطمینان دلانے کو ہلکے سے مسکرا کر کہا تو رضیہ بیگم نے بے اختیار ہی اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا۔ ایک اطمینان سا رگ و پے میں اتر گیا تھا۔ سکون سا تھا جس نے مفلوج دماغ کو راحت بخشی تھی۔ انہوں نے طمانیت سے آنکھیں موندی تھیں۔

"یا اللہ تیرا شکر۔"

فاطمہ مسکرائی تھی۔ انگلیاں اب بھی ان کے نحیف ہاتھوں پر چل رہی تھیں۔ لبوں پر ایک عجیب سا تبسّم بکھرا تھا۔

"شام میں ہی پہنچ گئی تھی وہ تو۔۔۔"، اس نے ان کی تسلّی کے لیے مزید کہا تو وہ آنکھیں کھولتے ہوئے فرطِ مسرّت سے مسکرا دیں۔ پھر اسے محبت سے دیکھتے ہوئے دو انگلیوں سے اس کی

ٹھوڑی پکڑی۔

"تم ٹھیک ہو؟"، اس کی آنکھوں میں جھانک کر انہوں نے اس انداز میں پوچھا کہ فاطمہ جھوٹ کہہ ہی نہ پائی۔ بے ساختہ ہی اس کا سر نفی میں ہلتا گیا تھا۔ آنکھوں میں پانی بھرتا گیا تھا۔ لب سختی سے آپس میں بھینچ گئے تھے۔

"نہیں۔"، اس کے لہجے میں ٹوٹے دل کی کرچیاں شامل تھیں۔ آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی سی صورت ٹپکتے ہوئے گالوں پر بہتے چلے گئے تھے۔ یوں محسوس ہوا تھا کہ گویا کسی نے تازہ زخم پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبا دیا ہو۔ تکلیف ناقابل برداشت ہوتی محسوس ہوئی تو وہ آگے بڑھ کر جھٹ سے ان کے گلے سے آلگی۔

فاطمہ بچپن ہی سے زاویار صاحب کی بے حد لاڈلی رہی تھی۔ اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ جتنی محبت زاویار صاحب کو اس سے تھی، اس سے کہیں زیادہ محبت وہ ان سے کرتی تھی۔۔۔ آج اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی تھی۔

باپ اپنے بچوں کے لیے ایک سپر ہیرو ہوتا ہے۔ اور اگر وہی باپ ولن کے روپ میں سامنے آ

جائے تو پراعتمادی اور آئیڈیلزم کی دیوار پر ایک دراڑ پڑتی ہے۔ ایک کیل ہوتی ہے جو یہ انکشاف بچے کے اعتماد کی نازک دیوار پر ٹھوکتا ہے۔ اس کے شیشے جیسے نازک سے اعتماد کو یہ کیل کرچی کرچی کر ڈالتی ہے۔

اس کا اعتماد بھی آج کرچی کرچی ہوا تھا۔ اس کا آئیڈیل ہیرو آج ولن نکلا تھا۔ یہ انکشاف ہی بہت بھاری تھا کہ اس کا وہ آئیڈیل باپ ہیرو نہیں، بلکہ ایک خطرناک سا، ظالم سا ولن ہے۔ ایک ایسا ولن جس نے اپنی اولاد کو اس قدر توڑ ڈالا کہ وہ چلی گئی۔۔۔ بغیر اپنی حفاظت کا سوچے۔ بغیر تنہائی کا سوچے۔ بغیر سوچے کہ وہ اس بھری دنیا میں اکیلی رہ جائے گی۔

باپ ایسے بھی ہوا کرتے ہیں۔ باپ سارے ہیرو نہیں ہوتے۔ کچھ ولن بھی ہوتے ہیں۔ اپنی ہی اولاد کی کہانی کے ولن!

فاطمہ سسکیوں اور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ رضیہ بیگم اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے افسوس میں گھری رہ گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ فاطمہ کو زاویار صاحب کتنے عزیز ہیں۔ وہ ان سے بے انتہا

محبت کرتی تھی۔ زاویار صاحب نے آج ایمان اور رضیہ بیگم کے ساتھ ساتھ اپنی پسندیدہ اور لاڈلی اولاد کو بھی کھو دیا تھا۔ وہ آج قسمت کے ہاتھوں ہار گئے تھے۔

اور جب قسمت اپنے کھیل شروع کرتی ہے تو یہ سارے کے سارے منصوبے، یہ سارا کا سارا ٹھاٹھ اور رعب دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ سارا غرور خاک میں مل جاتا ہے۔ ساری اکڑ ہوا ہو جاتی ہے۔

زاویار احمد خان صاحب کا غرور بھی آج بری طرح خاک آلود ہوا تھا۔

قسمت اگر فتح لاتی ہے تو شکست بھی لاتی ہے۔ وہ بھی آج شکست کھا گئے تھے۔۔۔ نہ ہی ایمان سے اور نہ ہی رضیہ بیگم سے۔ بلکہ اپنی قسمت سے۔

☆☆☆

شام کا آخری پہر تھا۔ رات کا اندھیرا مشرق سے نکلنے لگا تھا۔ شام کی جامنی روشنی چھٹنے لگی تھی۔ ایسے میں حیدر آباد کے ایک نجی ہسپتال کے اندر راہداری میں لگی نشستوں میں سے دو پر وہ

دونوں بیٹھی تھیں۔ رو رو کر ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ چہرہ مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا۔

تبھی آپریشن تھیٹر کے دروازے جدا ہوئے اور دو نوجوان ڈاکٹرز باہر آئے۔ وہ دونوں ہی فورا سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور تیزی سے ڈاکٹرز کی جانب بڑھی تھیں۔ انداز میں بے صبری تھی۔ اور اضطراب بھی۔

"پیشنٹ کے ساتھ آپ دونوں ہیں؟"، ایک ڈاکٹر نے خاصے پیشہ ورانہ انداز میں ان دونوں کی سمت دیکھ کر پوچھا تو وہ تیزی سے سر اثبات میں ہلانے لگیں۔ دونوں ڈاکٹرز نے سمجھ کر سر ہلایا تھا اور ان دونوں روئی روئی سی لڑکیوں کو دیکھا تھا۔

"آپ کے ساتھ کوئی بڑا نہیں ہے؟"، ڈاکٹر کا سوال فطری تھا۔ وہ دونوں کم عمر سی لڑکیاں تھیں۔ چھوٹی سی۔ نازک سی۔ نہ تو انہیں کوئی بات صحیح سے سمجھ آنی تھی اور نہ ہی ان سے سیچوئیشن ہینڈل ہونی تھی۔

دونوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ اتنے میں حسنہ آگے بڑھی تھی۔

"ہماری امی اور خالہ آنے ہی والی ہوں گی۔ میں نے انہیں اطلاع کر دی ہے۔"

"دیکھیں۔۔۔ آپ کے پیشنٹ کی داہنی ٹانگ بری طرح فریکچر ہو چکی ہے۔ یوں تو اور بھی بہت سی چوٹیں لگی ہیں مگر سب ہی ایسی چوٹیں ہیں کہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔۔۔ مگر ٹانگ کے بارے میں ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔۔۔ پتا نہیں کب ٹھیک ہو۔۔۔ اور ٹھیک ہو بھی یا نہیں۔ آپ لوگ بہت دعا کریں۔"، ڈاکٹرز تو کہہ کر چلے گئے تھے۔ مگر ان دونوں کی دنیا رک چکی تھی۔ وقت تھم گیا تھا۔ سانسیں بھی۔

وہ دونوں ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی تھیں۔ ایک صدمہ سا تھا جس سے دماغ مفلوج ہوتا محسوس ہوا تھا۔ ایک سکتہ سا ان پر طاری ہو گیا تھا۔ جسم سے جان جیسے نکل رہی تھی۔

"میرے اللہ۔"، رانیہ کا سکتہ پہلے ٹوٹا تھا۔ وہ پلٹ کر زور سے حسنہ سے لپٹ گئی تھی۔ آنسو پھر سے بہنے لگے تھے۔ جسم ہچکولے کھا رہا تھا۔ پس منظر میں کہیں اسٹریچر کے پہیوں کے قریب آنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ حسنہ سکتے کے عالم میں کھڑی آپریشن تھیٹر کے کھلتے دروازوں کو دیکھ رہی تھی جس سے اب دو وارڈ بوائز اسٹریچر کھینچتے ہوئے باہر لا رہے تھے۔ ایک دم سے

رانیہ کو خود سے دور کرتے ہوئے وہ اسٹریچر کی جانب لپکی تھی۔

اسٹریچر پر روحان یامین کا بے حرکت وجود بکھرا پڑا تھا۔ سر کے گرد بڑی سفید پٹی بندھی تھی۔ چہرے پر جا بجا نیلوں کے گہرے نشان تھے۔ ہونٹ کنارے سے سوجا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں ڈرپ لگی تھی جبکہ دوسرے پر بھی کلائی کی جگہ پر پٹی بندھی تھی۔ داہنی ٹانگ پوری طرح سے سفید پلاستر میں چھپی تھی۔ حسنہ روحان کا دل اس لمحے خون کے آنسو رو رہا تھا۔

وہ ساکت بھیگی نظروں سے روحان کا زخمی وجود دیکھتی گئی تھی۔ الفاظ جیسے کہیں اٹک گئے تھے۔ آنسو جیسے کہیں قید ہو گئے تھے۔ بس سانسیں تھیں جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بھاری ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

کیا دنیا ایک لمحے میں ختم ہو سکتی ہے؟

کیا انسان کی کل متاع ایک لمحے میں لٹ سکتی ہے؟

کیا انسان کی تمام خواہشیں ایک پل میں دم توڑ سکتی ہیں؟

ہاں! شاید ہاں!

ایک لمحہ۔۔۔ محض ایک لمحہ درکار ہوتا ہے اچھے سے برا، اور برے سے اچھا ہونے میں۔ صرف ایک لمحہ بہت کچھ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

وارڈ بوائز اسٹریچر کو لے گئے تھے۔ رانیہ نشست پر ڈھے جانے کے سے انداز میں بیٹھ کر اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ حسنہ اب بھی ساکت کھڑی تھی۔ صدمہ دماغ کو سن کرنے لگا تھا۔ جسم ساکت ہو گیا تھا۔ نگاہیں دور جاتے اسٹریچر پر اٹک کر رہ گئی تھیں۔ پس منظر میں اب کے دور جاتے اسٹریچر کے پہیوں کی آواز گونج رہی تھی۔

☆☆☆

فجر کراچی کے مضافات میں اتری تو جامنی سی روشنی ہر سو چھانے لگی۔ ایسے میں ہسپتال کے کمرے کا دروازہ کھول کر غزل رمیص اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ اب تک سیاہ عبائے میں ملبوس تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنا نقاب کھینچ کر اتارا تھا۔ اندر پلنگ پر ایمان سیدھی لیٹی

تھی۔ نگاہیں اوپر سفید سیلنگ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر جیسے کوئی تاثر ہی نہ جھلکتا تھا۔

غزل اسے نرمی سے دیکھتی ہوئی قریب آئی تھی اور کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی تھی۔ ایمان نے کرسی گھسیٹنے کی آواز پر دھیرے سے سر موڑ کر نگاہیں اس پر ٹکائی تھیں اور اگلے ہی پل اس کی آنکھوں میں اچھنبا اترا تھا۔ وہ بغور غزل کی سرخ سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ جبکہ غزل اب بھی اسی نرمی سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم اب جا سکتی ہو۔۔۔"، وہ ہلکا سا مسکرا کر بولی تو ایمان نے اسی تفکر سے اسے دیکھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"آپ روئی ہیں؟"، اس نے نرمی سے پوچھا تھا۔ غزل ہنوز ویسے ہی مسکراتی رہی تھی۔

"ہوں۔"، اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ ایمان اگلے ہی پل کہنی کے بل ہلکی سی اٹھ بیٹھی تھی۔ غزل اب بھی ویسے ہی پشت کرسی سے لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں؟"

ایمان کی آنکھوں میں تفکر سا ابھرا تھا۔

"دل چاہ رہا تھا۔ روئی نہیں تھی کافی عرصے سے دل کھول کر۔۔۔"، اس نے شانے ہلکے سے اچکائے تھے۔ "یو نو، دل کھول کر رونا بھی ضروری ہوتا ہے۔"، وہ نجانے کیسے مسکرا رہی تھی۔

ایمان اب کے صحیح سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"میں ثمرین کو بھیج رہی ہوں اندر۔ تمہارا بیگ بھی لے آئے گی ساتھ۔۔۔ تم ریڈی ہو جاؤ۔۔۔"، وہ ہلکا سا مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تو ایمان کا جی چاہا کہ اسے ایک پل کے لیے روک کر پوچھے کہ وہ اسے کہاں لے کر جا رہی ہے۔۔۔ اس کی اگلی منزل کون سی ہونے والی ہے؟ اب کون سی جگہ اس کی سسکیاں سننے کی منتظر ہے؟ مگر پھر بھی وہ خاموش رہی۔ کچھ بھی نہ کہا۔ کچھ بھی نہ پوچھا۔

☆☆☆

ہسپتال کے کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ ایک سوگواریت سی ماحول میں محسوس ہوتی تھی۔ سفید روشنی میں نہائے اس کمرے میں محض اے سی کی مدھم آواز گونج رہی تھی۔ یہ ایک سیمی

پرائیویٹ روم تھا جس کا دوسرا پلنگ فی الوقت خالی تھا سو وہاں اس وقت صرف وہی دونوں تھے۔

وہ پلنگ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی گیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو ہوش و حواس سے بیگانہ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سوکھے لب کھلے ہوئے تھے۔ چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے۔ سر پر بندھی پٹی کافی بڑی تھی۔۔۔ اتنی کہ اس کے ماتھا اس پٹی تلے پوری طرح چھپا ہوا تھا۔

کیا ہماری کل کائنات ایک ہی لمحے میں درہم برہم ہو سکتی ہے؟

کیا زندگی ایک ہی پل میں بے وقعت محسوس ہو سکتی ہے؟

کیا جان ایک ہی پل میں فنا ہو سکتی ہے؟

حسنہ کا اس وقت یہی حال تھا۔ ایسے جیسے اس کی کائنات درہم برہم ہو چکی ہو۔ ایسے جیسے اس کی زندگی ایک ہی پل میں بے وقعت ہو کر رہ گئی ہو۔ ایسے جیسے جان ایک ہی پل میں فنا ہو گئی ہو۔

تکلیف تھی کہ ہر گزرتے پل کے ساتھ بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔ اذیت تھی جو یوں معلوم ہوتی تھی جیسے کبھی ختم ہی نہ ہو گی۔

روحان کی والدہ اور خالہ کچھ دیر پہلے ہی ہسپتال پہنچی تھیں۔۔۔ اور روحان کی حالت دیکھ کر اس کی والدہ مزید تاب نہ لا سکی تھیں اور بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی سو حسنہ کی والدہ اور رانیہ انہیں گھر لے گئی تھیں۔ ابھی وہ ہسپتال میں بالکل اکیلی تھی۔ جو ساتھ ہوا کرتا تھا، وہ تو خود بے خرد تھا۔

وہ بھیگی پلکوں کو جھپکاتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی تھی اور سائیڈ ٹیبل پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا تھا۔ چند نمبر ز ڈائل کر کے اس نے فون کان سے لگایا اور اگلی جانب جاتی گھنٹیاں سننے لگی۔ چند ہی گھنٹیوں کے بعد فون اٹھا لیا گیا تھا۔ وہ جیسے جھپٹنے کے سے انداز میں زور سے بول پڑی تھی۔

"مل گئی آپ کے کلیجے کو ٹھنڈ؟ پڑ گیا دل میں سکون؟ خوش ہو گئے آپ؟ کھا لیں میری خوشیاں آپ نے؟"، بولتے بولتے آنسو گالوں پر پھسلتے چلے گئے تھے۔ اذیت پانی بن کر آنکھوں سے بہنے لگی تھی۔ چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ روحان یونہی بے سدھ اور بنا کسی جنبش کے پڑا رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے، حسنہ؟ از ایوری تھنگ فائن؟"، رضا نے اگلی جانب سے خاصی پریشانی سے پوچھا تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر اٹھ بیٹھا تھا۔ نیند تو ویسے بھی آنکھوں سے کوسوں دور ہی تھی۔ ٹینشن تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ دماغ تھا کہ روحان اور ایمان کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا۔۔۔ اوپر سے حسنہ کی یہ باتیں!

"فائن؟"، وہ جیسے ضبط کھو بیٹھی تھی۔ تقریبا چیختے ہوئے اس نے اشتعال و بے بسی سے کہا تھا۔

"فائن ہو سکتی ہوں میں اس سب کے بعد؟ سکون مل سکتا ہے مجھے؟"، دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ مگر آنسو خاموشی سے اس کے ضبط کا امتحان لیتے بہتے جا رہے تھے۔

"کیا ہوا ہے؟"، رضا کے ذہن میں جیسے خطرے کا الارم بجا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے پلنگ سے اٹھ کر کھلی کھڑکی کی جانب بڑھا تھا۔ چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔ شہد رنگ آنکھوں میں نمی بھرنے لگی تھی۔ کھڑکی کے باہر نظر آتی لندن کی مصروف سڑکوں پر سے گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ کسی کو کیا علم کہ یہیں اس سرزمین میں کوئی انسان اس قدر بے چین کھڑا ہے۔

"روحان اور مجھے برباد کر دیا اور پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا؟ اتنے سنگدل کیسے ہو سکتے ہیں آپ؟ اتنے

ظالم کیسے ہو سکتے ہیں؟"، اس کے حلق میں درد ہونے لگا تھا۔ آنسوؤں نے رفتار پکڑ لی تھی۔ چہرہ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔ ہر شے دھندلاتی جا رہی تھی۔ رگوں میں دوڑتا لہو جوش مارنے لگا تھا۔

"روحان کو کیا ہوا ہے، حسنہ؟"، رضا نے جلتی آنکھیں درد سے میچتے ہوئے کس قدر برداشت سے پوچھا تھا، یہ صرف اس کا رب ہی جانتا تھا۔ وہ تکلیف اور اذیت کی گہرائیوں میں موجود تھا۔ آنکھوں سے گرم سیال لڑیوں کی مانند رخساروں پر سے پھسلتا ہوا نیچے گرتا چلا گیا تھا۔

"روحان۔۔۔"، اور وہ مزید نہ کہہ سکی تھی۔ پھپھک کر بری طرح سے روتے ہوئے وہ کرسی سے ہٹتی زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ جسم سے ساری جان جیسے نچوڑ لی گئی تھی۔ ہمّت کے سارے بندھ جیسے ٹوٹ گئے تھے۔ وجود پھوڑے کی مانند درد کر رہا تھا۔ ہر شے اس کے درد میں ملوث اس کے درد کو سوا کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے اسے، حسنہ؟ کچھ تو بولو۔"، وہ بے بسی کے مارے چیخ پڑا تھا۔ حسنہ نے زور سے آنکھیں رگڑی تھیں۔ بھیگا چہرہ ہاتھ کی پشت سے پونچا تھا اور سر اٹھا کر ہسپتال کے چمکتے سفید ماربلز کو دیکھا تھا۔ کیا ہوتا جو اس کی زندگی بھی اسی فرش کی مانند شفاف ہوتی؟ کوئی دکھ درد اس

کی زندگی کا حصّہ نہ ہوتا؟

مگر زندگی آسان ہو ہی کہاں سکتی ہے؟

"اپاہج ہو گیا ہے وہ ساری زندگی کے لیے۔۔۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اس کا۔"، وہ بلند آواز میں چیخ کر بول پڑی تھی اور ارتضی مراد کے تو مانو کاٹو تو بدن میں لہو نہ ملے۔ چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر ساکت ہو کر ٹھہر گئی تھیں۔ لب خود بخود ہی کھل گئے تھے۔ سانس کچھ پلوں کے لیے جیسے تھم گیا تھا۔

"مار دیا آپ نے اسے، اس کے ارمانوں، اس کے خوابوں کو۔۔۔ ہو جائیں اب خوش۔ بہت مبارک ہو آپ کو۔"، حسنہ کی آواز گھٹتی چلی گئی تھی۔ سر خود بخود ہی جھکتا چلا گیا تھا۔ کیا یہ تکلیف کبھی ختم ہونی بھی تھی؟ کیا اس اذیت کا کوئی اختتام ہونا تھا؟ یا زندگی یوں ہی درد بھری رہنی تھی؟

"ک۔۔۔ کہاں ہے وہ ابھی؟"، اٹک اٹک کر اس نے پوچھا بھی تو محض اتنا۔ آنکھوں کے

پپوٹے پانی سے بھرنے لگے تھے۔ وہ بھی وہاں پرائے دیس میں ڈھے جانے کے سے انداز میں زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ حسنہ نے چہرہ اٹھا کر بھیگی آنکھوں سے بے ہوش پڑے روحان کو دیکھا تھا۔ دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھی تھی۔

"بے ہوش ہے۔ میرے سامنے ہی ہے۔"، اس کی آواز مدھم شکست خوردہ ہوتی چلی گئی تھی۔ ارتضی کا دل انجانے خوف سے زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ کہیں وہ اپنے بہترین دوست کو کھو نہ دے۔۔۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ اٹھے تو ارتضی کی شکل سے نفرت کرنے لگے۔۔۔ کہیں۔۔۔ کہیں۔

ایسے بہت سے "کہیں" اس کے ذہن میں گونجتے دماغ میں درد کی ٹیسیں پیدا کر رہے تھے۔ بے بسی کی انتہا شاید یہی ہوتی ہے۔ جو حالت ارتضی مراد کی پردیس میں اس وقت ہو رہی تھی۔۔۔ شاید اسے ہی بے بسی و بے کسی کا نام دیا جاتا ہے۔ جب انسان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہوں اور آنکھیں اس کی بربادی دیکھ رہی ہوں، تب ہی تو ہوتی ہے بے بسی کی انتہا!

تمام خوف گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ تمام پریشانیاں گھوم گھوم کر دماغ میں ابھر رہی تھیں۔ تبھی

ان خیالات، تفکرات اور تکالیف کے درمیان یکدم ہی ایک چہرہ ابھرا تھا۔۔۔اور یہاں ارتضی مراد کے دل نے ایک دھڑکن مس کی تھی۔ سانس جیسے سوکھ گیا تھا۔ چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ دل کسی نے زوروں سے مٹھی میں بھینچا تھا۔ ایک کراہ اس کے منہ سے آزاد ہوئی تھی۔

"وہ ہوش میں آئے تو میری بات کروا دینا اس سے۔"، مدھم ٹوٹی بکھری سی آواز میں اس نے دھیرے سے کہہ کر فون کان سے نیچے کیا تھا۔ بصارت دھندلا گئی تھی۔۔۔شاید زندگی بھی!

پردیس ظالم تھا!

ارتضی مراد کے لیے تو خصوصا!

☆☆☆

رمیص جہانزیب کے گھر کے باہر سیاہ گاڑی آکر رکی تھی۔ گاڑی میں سے پیسنجر سیٹ سے ثمرین سوئے ہوئے ارحم کو گود میں اٹھائے باہر نکلی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے سے بہادر بھائی نکلے تھے اور فورا پچھلی جانب بڑھ کر انہوں نے دروازہ کھولا تھا۔ غزل سر ہلکا سا ہلا کر باہر

نکلی تھی۔ دوسری جانب سے ایمان زاویار باہر نکلی تھی۔

اپنے سادہ سے ہم رنگ شلوار قمیض کے اوپر بڑی سنہری چادر لیے، وہ سادگی سے بیگ کاندھے پر لٹکائے اپنے سامنے کھڑے اس بڑے سے بنگلے کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ اور اگلے ہی پل اس نے اچھنبے سے چہرہ موڑ کر خود کے قریب آتی غزل کو دیکھا تھا۔

"یہ آپ کا گھر ہے؟"، اس کی آنکھوں میں ناسمجھی تھی۔ چہرہ پہ الجھن۔ غزل نے نرمی سے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔ ایمان اس کے ایک قدم قریب گئی تھی۔

"مجھے یہاں کیوں لائی ہیں؟"، اس کی حیرت میں اضافہ ہوا تھا۔ چہرے اور آنکھوں میں پنہاں الجھن اور ناسمجھی بڑھی تھی۔ غزل نے نرمی سے مسکرا کر اس کا شانہ تھاما تھا اور اس کا رخ گھر کی جانب کیا تھا۔

"تمہیں ایسے کہیں بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی میں۔۔۔ جب تک تمہارے لیے کسی مناسب جگہ کا بندوبست نہیں ہو جاتا، تم میرے ساتھ رہو گی۔۔۔"، وہ جیسے سب خود سے ہی ڈیسائیڈ کیے بیٹھی تھی۔ ایمان کی حیرت بڑھی تھی۔ فوراً ہی اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"ن۔۔۔ نہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔"، وہ سر نفی میں ہلاتی پیچھے ہوتے ہوئے کہتی جا رہی تھی۔۔۔ حتی کہ اس کی پشت گاڑی سے جا لگی تو وہ رک گئی۔ غزل مڑ کر اس کے قریب آئی تھی۔

"بات سنو، ایمان۔۔۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔۔۔ بس یہ ہم ہی ہیں جو ہر دوسری شے کو ناممکن کا ٹیگ لگا دیتے ہیں۔ تمہارے یہاں رہنے میں کیا مسئلہ ہے، یہ بظاہر تو مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔۔۔ ہو سکے تو تم مجھے سمجھا دو۔"، وہ سینے پہ بازو لپیٹے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر کھڑے بہادر بھائی دھیرے سے مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے مین گیٹ بند کرنے چلے گئے تھے۔ پیچھے غزل اب بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ابرو اٹھا رکھی تھیں۔ آنکھیں سنجیدہ دکھتی تھیں۔

ایمان نے منمناتے ہوئے چہرہ اٹھا کر ایک بار پھر اس عالیشان سے گھر کو دیکھا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے اپنی زندگی مفلسی اور غربت میں گزاری تھی۔ اس کا تعلق اپر مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ زاویار صاحب کی تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ انہوں نے ان سب کو کبھی کسی شے کی کمی نہیں

ہونے دی تھی۔ مگر پھر بھی، نجانے کیوں اسے یہاں رہنے میں قباحت ہی نظر آ رہی تھی۔

"بس۔ میں نہیں رہ سکتی یہاں۔"، اس نے ایک بار پھر غزل کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے منع کیا تھا۔ غزل ایک بار پھر مسکرائی تھی۔

"دیکھو ایمان۔ میں اتنی دیر یہاں کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اندر چل کر بات کرتے ہیں۔ ہوں؟"، وہ کہتے ہوئے اس کے قریب آئی اور اس کو بازو سے تھامے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ ایمان خاصی ہچکچاہٹ لیے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے نگاہیں جھکا رکھی تھیں۔ چہرہ پر عجیب سی الجھن تھی۔

غزل رمیص کا گھر اچھا خاصا بڑا تھا۔ نجانے کتنے کمرے، کتنی جگہیں تھیں۔ وہ بس ہر جگہ سے چپ چاپ گزرتی جا رہی تھی۔ اس کا بازو پکڑے بالآخر غزل ایک کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اسے لیے صوفوں تک آئی تھی۔ ایک صوفے پر اسے بٹھا کر وہ خود بھی اس سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔ اب کے ایمان نے دھیرے سے آنکھیں اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھی غزل کو دیکھا

تھا۔

وہ اب اپنا سیاہ نقاب کھینچ کر اتار رہی تھی۔ نقاب ہٹتے ہی اس کا خوبصورت شفاف سا چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ ایمان کی نظریں اس کے چہرے پر اٹک کر رہ گئی تھیں۔ نجانے کیا تھا اس چہرے میں کہ نظریں ہٹانے کا جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ اب غزل کھڑی ہو کر اپنا عبایا اتار رہی تھی۔ عبائے کے اندر اس نے لان کا سادہ سا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ غزل رمیص کی ہر بات میں وہ بات تھی کہ انسان بات کرنا بھول کر صرف اسے تکتا رہے۔ غزل مسکراتے ہوئے اس کے سامنے پھر سے بیٹھ گئی اور عبائے کا سیاہ دوپٹہ شانوں پر پھیلا لیا۔

ایمان کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اب کے اس کے سیاہ بالوں تک گئی تھیں۔ اس کے بال جٹ بلیک تھے۔ گھنے، سلکی، چمکدار۔۔۔ اس وقت بال ایک ڈھیلے سے جوڑے میں مقید تھے۔ اس کے بال بہت خوبصورت تھے۔ وہ خود بھی بہت خوبصورت تھی۔

ایمان زاویار نے اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی آج تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کا حسن کامل لگتا

تھا۔ بالکل کسی ماہ کامل کی مانند۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کو دیکھے گئی تھی۔ جبھی غزل نے مسکرا کر اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا تھا۔ ایمان یکدم ہی جیسے اس حسن کی دنیا سے باہر آئی تھی۔

"دیکھیں آپ سمجھنے کی کوشش کریں، غزل۔۔۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے عادت نہیں ہے ایسے گھروں میں رہنے کی۔"، اب کے اس نے نگاہیں جھکا کر اپنی گود میں دھرے اپنے ہاتھوں پر ٹکا دی تھیں۔ اس کے چہرہ پر اب کے ایک سنجیدگی چھائی تھی۔ آواز چہرے سے بھی زیادہ سنجیدہ معلوم ہوتی تھی۔

"عادت بنانے کو کون کہہ رہا ہے؟ تم بس آرام سے یہاں رہو۔ اس دنیا اور اس کی چیزوں کی عادت تو ویسے بھی نہیں بنانی چاہئے۔"، غزل نے اپنے ازلی نرم لہجے میں اس کو نرمی سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تو ایمان لاجواب سی ہو گئی۔ نگاہیں اٹھا کر اس نے خالی خالی نظروں سے غزل کو دیکھا تھا۔

ایمان کو اس کی نرمی سے ایک بار پھر کسی کی نرمی یاد آئی تھی۔ بے اختیار ہی اس کی آنکھوں میں

پھر سے نمی امڈ آئی تھی۔ اس نے انگلی کی پور سے آنکھوں کی کناریاں صاف کی تھیں اور ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"میں آپ سے کہہ رہی ہوں ناں کہ آپ مجھ سے اتنی نرمی سے پیش نہ آئیں۔"، اس نے خاصے تکان زدہ سے لہجے میں دھیرے سے کہا تو غزل حیرت سے اسے دیکھے گئی۔ اسے اس کی نرمی بری لگ رہی تھی؟ کیا ایسا بھی کوئی ہوتا ہے اس دنیا میں؟ "کیا مطلب؟ تم کہہ رہی ہو کہ میں تم سے پیار سے بات نہ کروں؟ سیریئسلی؟"، وہ جیسے بہت حیران ہوئی تھی۔ ایک عجیب نا سمجھی والی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

"جی میں۔۔۔"، ایمان ابھی بولتے ہوئے سر نفی میں ہلانے ہی لگی تھی کہ سامنے دیوار پہ لگا فوٹو فریم دیکھ کر وہ ٹھہر سی گئی۔ آنکھیں بے ساختہ پھیلتی چلی گئی تھیں۔ بے اختیار ہی اس نے نگاہیں پھیر کر خود کو ہی دیکھتی غزل کو دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں کے رخ کو دیکھتے ہوئے غزل نے چہرہ موڑ کر دیکھا تھا۔ اور پھر سامنے لگا فوٹو فریم دیکھ کر افسردگی سے مسکرا کر چہرہ پھر سے ایمان کی جانب موڑا تھا۔

"ی۔۔۔ یہ؟؟؟"، وہ بہت حیران ہو کر فوٹو فریم کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں شدّت حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں سوال پنہاں تھا۔ غزل ہلکے سے مسکرائی تھی۔

"رمیص ہیں۔۔۔ رمیص جہانزیب۔۔۔ میرے شوہر (ایمان ساکت ہوئی تھی۔ آنکھیں غزل کے اداس چہرے پر اٹک کر رہ گئی تھیں)۔۔۔ مرحوم۔"، اور یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کا دل دھاڑیں مار مار کر خون کے آنسو رویا تھا۔ یہ الفاظ دل کو سو ٹکڑوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ہر بار تکلیف اتنی ہی ہوا کرتی تھی جتنی پہلی بار، پہلے دن، پہلے لمحے ہوئی تھی۔

"ر۔۔۔ رمیص جہانزیب؟ دی گریٹ رمیص جہانزیب؟ رمیص جہانزیب شہید؟ ریئلی؟" وہ جتنا حیران ہوتی اتنا کم تھا۔ غزل؟ غزل رمیص؟ یعنی کہ رمیص جہانزیب کی بیوی؟ اور یکدم ہی اس کا دل شدید دکھ میں گھر گیا تھا۔ رمیص جہانزیب کے ساتھ ہوئے واقعے کو بھولا ہی کون تھا؟ اور اتنی جلدی کوئی بھول بھی کیسے سکتا تھا؟ ابھی ماہ ہی کتنے ہوئے تھے؟

"آ۔۔۔ آپ سچ کہہ رہی ہیں؟"، اس کے لیے یقین کرنا مشکل تھا۔۔۔ بہت زیادہ مشکل۔ اسے آج بھی وہ دن یاد تھا جب اس نے ٹی وی پہ چلتی خبریں دیکھ کر دل تھام لیا تھا۔ رمیص جہانزیب

تمام پاکستانیوں سمیت ایمان کا بھی پسندیدہ جرنلسٹ تھا۔ وہ بہت شوق سے اس کا ہر پروگرام دیکھا اور سنا کرتی تھی۔ اس کی تقریریں ایسی ہوا کرتی تھیں کہ سننے والے کا ضمیر جھنجھوڑ ڈالیں۔ اسے سچ اور جھوٹ کے اس چوراہے پر لا کھڑا کریں جہاں چننے والا خود شرمندہ ہو جائے کہ سچ کو چھوڑنا اور جھوٹ کو اپنانا مشکل ہو۔

"انسان میں اتنی ہمّت تو ہونی چاہئے کہ وہ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہہ سکے۔"، وہ کہا کرتا تھا۔ اس کی وہ دم دار، جوش و جنون سے مزین آواز، آنکھوں کا کڑکتا عزم، بے خوفی، نڈر پن، اعلی ہمّتی، چمکتی سنہری آنکھیں، ہر شے اس کے پرستاروں کو اب تک اس کا گرویدہ بنائے ہوئے تھیں۔ کوئی بھول بھی کیسے سکتا تھا اس مجاہد کو؟ وہ کوئی بھولنے والی شے تو نہ تھا۔

ایمان کی آنکھوں کے گوشے بھرنے لگے تھے۔ آج پھر وہ سورما بہت شدّت سے یاد آیا تھا۔ اس کا فیورٹ سیلیبریٹی۔ اس کا رول ماڈل۔ ہوتے ہیں کچھ نام ایسے کہ جو صدیاں بیت جانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ تابندہ رہتے ہیں۔ رمیص جہانزیب بھی ایسے ہی ایک شخص کا نام تھا۔۔۔ بلکہ شاید نام نہیں تھا۔ پہچان تھا۔

غزل آنکھوں میں ڈھیروں نمی لیے ایمان کے چہرے کو تکتی جا رہی تھی۔ یہ شاید اس کے لیے فخر کی ہی بات تھی کہ رمیص جہانزیب کا نام اس کے نام سے جڑا تھا۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ اس کی پہچان تھا۔ اس کے ساتھ بتائے پل بھولتے ہی کہاں تھے؟ ذہن میں پھر اس کی مسکراہٹیں، کھلکھلاہٹیں اور قہقہے گونجے تھے۔

بتیے لمحے کچھ لوگوں کے لیے ناسور ہوتے ہیں، کچھ کے لیے یادیں اور کچھ کے لیے سبق۔ مگر کچھ بیتے لمحات فضا کی طرح ہوتے ہیں۔۔۔ خوشبودار، تازہ فضا کی طرح۔ جب وہ انسان کو چھوئیں تو نوسٹیلجیا ہونے لگتا ہے۔ نتھنوں سے آنسوؤں کی بو ٹکرانے لگتی ہے۔ فضا آنکھوں کو چھوئے تو اشک بہانے لگتی ہے۔ اور جسم سے ٹکرائے تو رونگٹے کھڑے کیے دیتی ہے۔

رمیص جہانزیب کے ساتھ بتائے تمام لمحات بھی ایسی ہی ایک فضا کی مانند تھے۔

"یو نو، ایمان؟ رمیص میرے ذہن سے محو ہوتے ہی نہیں ہیں۔ ان کا چہرہ، ان کی باتیں، ان کی ہنسی، ان کی سرگوشیاں، ان کا وہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھنا، ان کے ساتھ روزرات کو واک کرنا، ان کے ساتھ فیوچر پلان کرنا، ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے رہنا، ان کے چہرے کو دیکھ کر سوچنا

کہ اتنا حسین بھی کوئی ہو سکتا ہے کیا، ان کی باتیں سنتے ہوئے سوچنا کہ کوئی اتنا خوبصورت بھی بول سکتا ہے کیا، ان کی کیئر اور محبت دیکھ کر سوچنا کہ کیا کوئی کسی کو اتنا بھی چاہ سکتا ہے، ان کے ساتھ گزرا وہ وقت، وہ لمحے، وہ باتیں۔۔۔ میں کچھ بھولتی ہی نہیں ہوں۔"، ایک آنسو پلکوں کی باڑ کو توڑتا ہوا رخسار پر بہتا چلا گیا تھا۔ تکلیف ہر بار کی طرح اس بار بھی نئے سرے سے عود کر آئی تھی۔ ایک کے بعد ایک گرتے آنسوؤں سے رخسار بھیگنے لگے تھے۔ ایمان اسے دکھتے دل اور نم آنکھوں کے ساتھ دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کی تکلیف کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ اذیت میں تھی اور ایمان کو اسے دیکھ کر اذیت ہو رہی تھی۔

"وہ رمیص ہیں۔ وہ حسین ہیں۔ وہ زندہ ہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کتنے لکی ہیں ناں؟"، اس نے بھیگے چہرے کے ساتھ مسکرا کر ایمان کو دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر دکھ تھا اور آنکھوں میں آنسو۔

☆☆☆

بڑی مشکلوں سے اس نے پلکیں جدا کیں تو نگاہوں کے سامنے ہسپتال کی سفید روشن سیلنگ آئی۔ کمرے میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔ محض اے سی کی مدھم آواز اور ڈرپ کے قطروں کے گرنے کی آوازیں سماعت سے ٹکراتی تھیں۔ اسے اپنا آپ سن سا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی بھی حرکت کرنے سے قاصر ہو۔ سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ جسم اکڑا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

جبھی دھیرے سے ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو اس نے چہرہ موڑنا چاہا، مگر موڑنے سے قاصر رہا۔ شاید اس کا پورا جسم ہی سن ہوا ہوا تھا۔ دبے دبے سے قدم خود کی جانب آتے سنائی دیے تو اس نے آنکھیں بند کر کے کھولیں اور اگلے ہی پل نگاہیں ہلکی سی دائیں جانب موڑیں تو سامنے حسنہ کا رویا رویا سا ستا ہوا چہرہ سامنے آیا۔

اس کی آنکھیں کھلی دیکھ وہ ٹھہر سی گئی تھی، پھر اگلے ہی پل اس کے لب پھڑپھڑائے تھے۔ آنکھوں کے پپوٹے بھرے تھے۔ چہرہ ایک پل میں سرخ ہوا تھا۔ اور پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھے پھپھک کر رو دی تھی۔ وہ ساکت سا اسے روتے دیکھے گیا تھا۔ کیوں رو رہی تھی وہ؟

"آپ اب چل نہیں پائیں گے۔ پتا نہیں کب تک۔"، اس کے ڈاکٹر نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کافی افسوس اور دکھ سے اس سے یہ بات کہی تھی۔ تب وہ غنودگی میں تھا، سن کر سمجھ نہیں پایا تھا۔ مگر اب سماعتوں میں سنائی بھی دے رہا تھا اور سب سمجھ بھی آ رہا تھا۔

اس کے گلے میں گلٹی ابھری تھی۔ سانس ایک پل کے لیے تھما تھا۔ آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ بمشکل اس نے روتی ہوئی حسنہ کو دیکھا تھا۔ اور پھر وہ اور نہیں سہہ پایا تھا۔ اس کے ساتھ وہ بھی رو دیا تھا۔ آنسو لڑیوں کی سی صورت اس کی آنکھوں سے بہتے سفید تکیے میں جذب ہونے لگے تھے۔

تکلیف کیا ہوتی ہے، یہ آج تک صرف سنا تھا۔ بے بسی کیا ہوتی ہے، یہ صرف سوچا تھا۔ مگر آج سب پتا چل رہا تھا کہ تکلیف اور بے بسی کسے کہتے ہیں۔ اذیت کسے کہتے ہیں اور درد کسے کہتے ہیں۔ آج روحان یامین کو زندگی میں پہلی بار پتا چلا تھا کہ سر پر آسمان نہ ہونا کسے کہتے ہیں۔ پیروں کے نیچے سے زمین کھسک جانا کسے کہتے ہیں۔

وہ اپاہج ہو گیا تھا۔ شاید ساری زندگی کے لیے۔ اور محتاجی سے بڑھ کر تکلیف دہ کون سی بیماری ہو سکتی ہے؟ اس کا پور پور درد کر رہا تھا۔ شاید یہ درد اس چوٹ کا نہیں، بلکہ اس احساس کا تھا کہ وہ ناکارہ ہو گیا تھا۔ اس کے سارے خواب، ساری خواہشات، سارے ارادے۔۔۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کا دل بھی شاید ختم ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی، شاید!

حسنہ نے اسے درد کرتے گلے اور دہکتی انگارہ ہوتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ تکلیف میں تھا تو وہ کیسے سکون اور آرام سے رہ سکتی تھی؟

"روؤمت، روحان۔۔۔ پلیز۔"، وہ پھپھک کر روتے ہوئے بولی تھی اور تڑپ کر اس کے قریب آئی تھی۔ ٹانگوں میں جان باقی نہ رہی تھی۔ وہ بے جان ہوتی ٹانگوں سمیت زمین پر ہی بیٹھتی چلی گئی تھی۔ روحان نے متورم بھیگی ہوئی آنکھیں اس کی سمت موڑی تھیں۔ وہ زمین پر بیٹھ کر اس کا ڈرپ والا ہاتھ تھامے سر اس کے ہاتھ سے ٹکائے رونے لگی تھی۔

کمرے کی فضا میں سوگواریت رچی بسی ہوئی تھی۔ ہر شے ان کے غم میں برابر کی شریک ہوئی

سوگ مناتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دل تھا جس میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ایک دماغ تھا جو سن سا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک جسم تھا جو بے جان ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک روح تھی جو زخمی ہوئی درد سے بلبلا رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ رمیص جہانزیب کے گھر میں خاموشی چھائی تھی۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر پورچ کی بتیوں سے ہی پورے گھر میں نیم روشنی منعکس ہو کر آ رہی تھی۔ ایسے میں لاؤنج سے منسلک راہداری میں موجود گیسٹ روم میں ہلکی نیم روشنی چھائی تھی۔

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے، آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر ٹکائے نیم دراز تھی۔ سیاہ آنکھوں میں ہلکی نمی دکھتی تھی۔ چہرہ پر کوئی انجانا سا تاثر پنہاں تھا۔ کمرے میں محض پنکھے کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

"مجھے آج سے پہلے کبھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ تم اتنی خوبصورت ہو۔"

کمرے کی فضا میں کسی کی نرم گرم سی آواز پھیلتی فضا کو معطر کر رہی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس خارج کر کے آنکھیں موندیں تو ذہن کے پردے پر کسی کا چہرہ ابھرا۔ وہی سنجیدہ سو برسا چہرہ۔ وہی کسی اپنے اپنے سے شخص کا چہرہ۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے چند سالوں پہلے کے کچھ مناظر گھومنے لگے تھے۔

لمحے پیچھے جاتے رہے۔ وقت کا پہیّہ الٹا چلنے لگا۔ اس نے ماضی کے حوالے خود کو کر کے ایک بار پھر آنکھیں موندلیں۔

دو سال پہلے۔۔۔

رات کا وقت تھا مگر حیدر آباد میں رونقیں خوب عروج پر تھیں۔ زاویار احمد صاحب کے گھر کی پچھلی گلی میں زرد رنگ کا ٹینٹ لگا تھا۔ زمین پر دریاں بچھائی گئی تھیں۔ میزیں اور کرسیاں گول دائروں کی صورت رکھی گئی تھیں۔ ہر جانب ایک چھل پہل سی لگی تھی۔ لڑکیوں کی

کھلکھلاہٹیں اور مسکراہٹیں فضا کو مزید تازگی بخش رہی تھیں۔

آج روحان یامین کا حسنہ کے ساتھ نکاح تھا۔ چونکہ ابھی صرف نکاح ہونا تھا اور باقی فنکشنز پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہونے تھے، سو روحان کی والدہ نے اپنی تمام خواہشیں اور آرزوئیں ابھی فی الحال کے لیے نکاح پہ ہی پوری کر لی تھیں۔ خوب دھوم دھام سے نکاح انجام پا رہا تھا۔

روحان کے گھر کے اندر باہر لائٹیں لگی چمچما رہی تھیں۔ ہر شے خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایسے میں گھر کے اندرونی حصّے میں لاؤنج گھیرے بہت سی لڑکیاں بیٹھی گیت گانے میں مصروف تھیں۔ ایک ہلّا غلا سا لگا تھا۔ مسکراہٹیں ہر سو بکھری ہوئی تھیں۔ تازہ گلابوں اور موتیے کے پھولوں کی خوشبوئیں فضا کو معطر کیے ہوئی تھیں۔

جبھی سیڑھیاں اترتی ہوئی کوئی اپسرا لاؤنج میں آتی داخل ہوئی تھی۔ ہاں، کوئی اپسرا ہی تو تھی وہ! بادامی رنگ کی پیروں تک آتی گھیر دار فراک کے نیچے ہم رنگ چوڑی دار پاجامہ پہنے، دوپٹے کو شانوں پہ پھیلائے وہ کھلاتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور تمام لڑکیوں کو دیکھا

تھا۔

اس کی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نگاہیں ادھر ادھر گھماتی وہ کسی کو تلاش کر رہی تھی، جبھی وہ اسے ایک کونے میں بیٹھی نظر آ ہی گئی تھی۔ ہلکا سا مسکرا کر وہ تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھی تھی۔ اس کے تیزی سے چلنے سے اس کے جھمکے ملتے جلتے اس کی سماعتوں میں ارتعاش سا پیدا کر رہے تھے۔

"یہاں بیٹھی ہو تم، ہاں؟ تمہیں ڈھونڈ رہی تھی میں۔"، سبز آنکھوں والی پیاری سی لڑکی کا ہاتھ تھام کر اس نے مسکرا کر کچھ روہانسے لہجے میں کہا تو سبز آنکھوں والی لڑکی مسکرا دی۔ وہ اسی کی ہم عمر لگتی تھی۔ سبز رنگ کی گھیر دار پیروں کو چھوتی فراک کے ساتھ ہم رنگ چوڑی دار پاجامہ پہنے، وہ بالکل اسی کی جیسی لگ رہی تھی۔ دونوں کے جھمکے بھی ایک سے تھے اور فراک بھی دونوں کی ایک انداز اور اسٹائل میں سلی ہوئی تھی۔

"ہاں جی۔۔۔ دیکھ آئیں تم دلہن کو؟ اچھی ہے ناں؟"، سبز آنکھوں والی نے مسکرا کر اسے کھینچ

کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے مزے سے کہا تو اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"بہت خوبصورت ہے۔۔۔ بالکل چھوٹی سی، پیاری سی دلہن۔۔۔ ہم سے بھی چھوٹی لگ رہی ہے مجھے تو۔۔۔"، اس نے مسکرا کر چمکتی آنکھوں کے ساتھ کہا تو سبز آنکھوں والی نے سر نفی میں ہلا یا۔

"اونہوں۔ روحان نے بتایا تھا کہ ہماری جتنی ہی ہے۔ بس کلاس میں ہم سے پیچھے ہے۔ ورنہ ایج سیم ہے۔"، اس نے بتایا تو اس کی سیاہ آنکھیں چمکیں۔ پھر وہ دھیرے سے اس کے کان کے پاس جھکی۔

"روحان کو دیکھا تم نے؟ دولہا بنا ہو گا ناں؟ پیارا لگ رہا ہو گا، نہیں؟"، اس کے لہجے میں ایکسائٹمنٹ تھی۔ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"مس ایمان۔ آپ خود جا کر کیوں نہیں دیکھ آتیں ہمارے حسین دلہے صاحب کو؟ جاؤ، باہر اسٹیج پر ہی بیٹھا ہے۔ گیٹ کی اوٹ سے دیکھ لو اسے۔"، سبز آنکھوں والی لڑکی نے مسکرا کر کہا تو ایمان نے کچھ ٹھہر کر اسے دیکھا، پھر آنکھیں سکیڑیں۔

"میں نوٹ کر رہی ہوں۔ تم ویسی فرینک نہیں رہی اب میرے ساتھ۔۔۔ہاں بھئی، اسلام آباد کی بر گر بچّی بن گئی ہو ناں۔"، مزے سے کہتے ہوئے وہ اس کی ناک ہلکے سے کھینچتی کھڑی ہو کر بھاگ گئی تھی۔ پیچھے میرال نے ہنس کر سر جھٹکا تھا۔ ہاں! وہ واقعی صحیح کہہ رہی تھی۔ وقت بعض اوقات ایسی دیوار حائل کر دیتا ہے لوگوں کے بیچ کہ تم کہنے والے آپ کا تکلّف کرنے لگتے ہیں اور "مونی" کہنے والے "ایمان" کا۔

لب دبائے وہ تیز قدموں سے چلتی دروازے تک پہنچی تھی اور دروازے کو پکڑے اس نے گردن باہر نکال کر آنکھیں ادھر ادھر گھمائی تھیں۔ کافی فاصلے پر چھوٹے سے اسٹیج پہ رکھے صوفے پر روحان یامین بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ سفید سادہ سے بے داغ شلوار قمیض کے اوپر سفید ہی واسکٹ پہنے وہ بڑا ہینڈسم لگ رہا تھا۔ دلہن کی ہی طرح۔۔۔ بالکل چھوٹا سا، پیارا سا دلہا۔ ایمان کھلکھلائی تھی۔

ایک آخری نظر اسے دیکھ کر وہ واپس جانے کے لیے مڑی تھی اور اپنی ہی دھن میں وہ ایک قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ تصادم کسی چٹان سے ہوا تھا۔۔۔ہاں، چٹان ہی تو تھا وہ! اتنا سخت۔ پتھر

جیسا۔ اس نے بے اختیار درد سے بلبلا کر ناک پر ہاتھ رکھا تھا۔ سب سے زیادہ زور سے ناک پر ہی لگا تھا۔ مقابل نے بھی ہلکا سا چیخ کر اپنا بازو سہلایا تھا۔

اس نے تنک کر اس چٹان کو دیکھا تھا اور پھر جیسے وہ ٹھہر سی گئی تھی۔ وقت ٹھہر سا گیا تھا۔ لمحہ پاز ہو گیا تھا۔ پس منظر جیسے کچھ رہا ہی نہیں۔ رہ گیا تو بس وہ ایک لڑکا جو خفا خفا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل تھے۔ آنکھوں میں خفگی تھی۔ چہرہ پر ناراضگی۔

مگر اسے دیکھتے ہی نجانے کیسے، بل کم ہونے لگے تھے۔ یہاں تک کہ کم کم ہوتے ہوتے پیشانی بالکل صاف ہو گئی۔ آنکھوں میں ٹھہری خفگی ایک حیرانگی سے ریپلیس ہوتی چلی گئی تھی۔ ناراضگی کہیں دور جا سوئی تھی۔ اس کی نگاہیں اس ایک لڑکی کے چہرے پر اٹک کر رہ گئی تھیں۔

بادامی رنگ کے چمچماتے لباس میں ملبوس وہ کوئی پری معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر ہلکا پھلکا میک اپ کر رکھا تھا۔ آنکھیں کاجل سے لبریز حسین ترین لگ رہی تھیں۔ اس کے وہ بڑے بڑے جھمکے بھی ہلتے ہوئے ساکن فضا میں خلل پیدا کر رہے تھے۔ فرانسیسی چوٹی میں بندھے سیاہ گھنے

بال، اور سائیڈوں سے نکلتی آوارہ گھنگریالی لٹیں، گلے میں پہنا نازک سا نگینوں والا ہار، دمکتی ہوئی گندمی رنگت۔۔۔

اور اس لمحے ارتضی مراد کا دل پہلی بار عجیب طرح سے دھڑکا تھا۔ آنکھیں پہلی بار یوں کسی چہرے پر ساکت ہوئی تھیں۔ سانس پہلی بار اس طرح سے تھمی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی، اس بات کا اندازہ بھی آج اسے پہلی بار ہی ہوا تھا۔ وہ جو ابھی تنک کر کچھ کہنے ہی والی تھی، ٹھہر سی گئی تھی۔

نگاہیں ارتضی مراد پر اٹکی تھیں۔ وہ سفید رنگ کے شلوار قمیض پہنے، سلیقے سے شہد رنگ بال سیٹ کیے، بہت جاذب نظر لگ رہا تھا۔ ایمان نے بے اختیار ہی نگاہیں جھکائی تھیں۔ لب دانتوں تلے دبا کر اس نے خود کو کمپوز کیا تھا اور پھر اگلے ہی پل چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اب بھی انہی کھوئی کھوئی سی نظروں سے اسے تکتا جا رہا تھا۔ یوں جیسے وہ کوئی خواب ہو جو آنکھیں بند کرنے پر غائب ہو جائے۔ اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔

"اہمم۔"، ایمان نے دھیرے سے گلا کھنکارا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ ایک گہرا سانس خارج کر کے اس نے چہرہ جھکا کر اٹھایا تھا۔ دل اب بھی غیر معمولی رفتار پر دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں اب بھی اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں، مگر اب وہ اپنی حالت پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟"، اپنے ازلی متوازن و سوبر سے لہجے میں اس نے سنجیدگی سے ہاتھ پشت پر باندھ کر پوچھا تھا۔ ایمان ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"دلہے بھائی کو دیکھنے آئی تھی۔"، اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ ارتضی نے بے اختیار ہی لبوں پر امڈ کر آتی مسکراہٹ روکی تھی۔

"اس طرح چھپ کر کیوں دیکھ رہی ہو؟ جا کر دھڑلے سے سب کے سامنے دیکھو۔"، صاف ظاہر تھا کہ وہ مسکراہٹ بمشکل روک رہا تھا۔ ایمان کو بھی اس بات کا اندازہ اچھی طرح ہو رہا تھا۔ اس نے لب گول کر کے اسے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا تھا۔

"آپ سے کسی نے مشورہ مانگا، رضا صاحب؟"، اس کا انداز جتاتا ہوا تھا۔ رضا نے بے ساختہ ہنس کر سر جھٹکا تھا۔

"نہیں، مگر مانگنا تو چاہیئے تھا۔ آخر کو میں دولہے کا شہوالا جو ٹھہرا۔"، اس نے کاندھے اچکا کر مسکراتے ہوئے کہا تو ایمان نے ابرو اٹھا کر اسے کچھ حیرانی سے دیکھا۔

"اتنا بڑا شہوالا؟ پہلی بار دیکھا ہے میں نے تو۔"، وہ سر جھٹک کر ہنس دی تھی۔ رضا بھی ہنس دیا تھا۔

"اتنا حسین شہوالا بھی تو پہلی بار دیکھا ہے۔ یہ مینشن نہیں کیا آپ نے؟"، وہ شرارتی انداز میں بولا تو ایمان نے ابرو پھر سے اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کس نے کہہ دیا آپ سے یہ، جو اتنی بڑی غلط فہمی ہو گئی آپ کو؟"، رضا کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"ہمارے حسن کے دیوانے تو بہت ہیں دنیا میں۔ کس کس کے نام گنوائیں؟"، وہ کچھ بیچارگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو ایمان نے لب اوہ کی سی صورت گول کیے۔ پھر بازو سینے پہ لپیٹتی ایک قدم قریب آئی۔

"سستے نشے تو نہیں کرنے لگے تم؟"، اس کا لہجہ اور اس کا انداز اس قدر تفتیشی تھا کہ رضا کے

پیٹ میں زوروں کی گدگدی ہوئی۔ وہ بے اختیار ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ ایمان نے لب بھینچ کر اسے دیکھا تھا۔

"سخت زہر لگ رہے ہو ایسے ہنستے ہوئے۔"، اس نے تنک کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو رضا کی ہنسی ایک بار پھر چھوٹی تھی۔ ہاتھ ہنوز پشت پہ باندھے وہ ایک قدم قریب آیا تھا اور سر جھکا کر اسے دیکھا تھا۔

"کم از کم آپ سے تو کم، محترمہ۔۔۔ پانچ کلو میک اپ کر کے، اتنے بڑے جھمکے پہن کے بھی آپ اتنی زہر لگ رہی ہیں کہ کیا بتاؤں میں آپ کو۔"، کہہ کر وہ ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنس دیا تھا۔ ایمان نے لب بھینچ کر ایک گہرا سانس لیا تھا اور اس کو خونخوار نظروں سے دیکھتی ہوئی وہ اس کے قریب آئی تھی۔

"آپ سے پوچھا میں نے، مسٹر؟"

"اگزیکٹلی۔ میں نے بھی آپ سے نہیں پوچھا تھا۔"، وہ تپانے میں ماہر تھا۔ بہت ماہر۔ اور ایمان کو تپانے میں تو شروع سے ہی بہت مزا آیا کرتا تھا۔ ایمان نے کچھ قریب آ کر ایک دم سے زور

سے اس کے پیر پر اپنا ہیل والا پیر پٹخا تو وہ ہنستے ہنستے یکدم ہی درد سے بلبلا اٹھا۔

"آہ۔۔۔ پاگل عورت۔"، درد سے پاؤں سہلاتے ہوئے اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اب کی بار وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"اگلی بار بچ کر رہنا، مسٹر ارتضی مراد۔"، وہ چوٹی ایک ادا سے جھٹکتی اسے ایک آخری نظر دیکھتی وہاں سے چلی گئی تھی۔ ارتضی نے پیر سہلاتے ہوئے نگاہیں اٹھا کر اس کو دیکھا تھا۔ اس کی لمبی چوٹی اس کی پشت پہ لہراتی جا رہی تھی۔ بے ساختہ ہی ایک خوبصورت مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ یہ لڑکی آج بھی ویسی ہی مست تھی۔۔۔ پاگل کہیں کی!

اس نے سوچ کر سر جھٹکتے ہوئے گیٹ کے پاس رکھے اپنے جوتے پہنے تھے اور قدم باہر کی جانب بڑھائے تھے۔ قدم تو بڑھ گئے تھے مگر دل اسی ایک لڑکی پر اٹک کر رہ گیا تھا۔ دماغ اسے اب بھی سوچ رہا تھا۔ یہ رات یکدم ہی بہت زیادہ خوبصورت لگنے لگی تھی۔ ہر ایک شے کی خوبصورتی یکدم ہی بڑھ گئی تھی۔

اور اسی رات ایمان زاویار کے انسٹا گرام اکاؤنٹ پر کسی کی میسج ریکوئیسٹ آئی تھی۔ کسی نے

وائس نوٹ بھیجا تھا۔ اور پھر جب ایمان نے کچھ حیرت سے اس کا وائس نوٹ اوپن کر کے موبائل کان سے لگایا تو وہ ساکت ہوئی تھی۔ دل کی دھڑکنوں نے رفتار پکڑی تھی۔ اس نے نجانے کتنی ہی بار وہ وائس میسج پلے کر کے سنا تھا۔

"مجھے آج سے پہلے کبھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ تم اتنی خوبصورت ہو۔"

وہ کتنا خوبصورت بولتا تھا ناں! اور کتنی خوبصورتی سے بولتا تھا! وہ اس کی دھیمی آواز اور لہجے کے سحر میں اس روز پہلی بار جکڑی تھی۔ وہ بچپن کا ارتضی نہیں رہا تھا۔ یا شاید وہ بچپن والا ارتضی ہی تھا۔۔۔ بس اس کا دل بدل گیا تھا۔۔۔

حال۔۔۔

ایک بے مول سا آنسو اس کی آنکھ سے ٹپکتا رخسار پر بہہ چلا تھا۔ وہ اسے سوچتی تھی تو اچھا لگتا تھا، مگر ہمیشہ دکھ اس پسندیدگی پر حاوی ہوا کرتا تھا۔ وہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اپنے خواب پورے کرنے۔ اپنی دنیا بنانے۔ اپنی زندگی بنانے۔ پیچھے تو وہ رہ گئی تھی ناں!

وہی بے مول سی لڑکی!

ہاں مگر اس نے کم از کم اپنی محبت کو پرووتو کیا تھا ناں! مگر کیا محبت ایک انکار یا اقرار کی قائل ہوتی ہے؟

کیا ایک انکار یا ایک اقرار محبت کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ ایسا ہوتا تو ایمان کی محبت بھی ختم نہ ہو جاتی؟ اس کی محبت اور چاہت تو آج بھی ختم نہ ہوئی تھی۔ تو ثابت ہوا کہ محبت اقرار اور انکار سے بالاتر جذبہ ہے۔ کسی کا ہاں یا نہ اس پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتا۔۔۔

وہیں رمیص جہانزیب کے گھر کے دوسرے حصّے میں غزل رمیص کے کمرے میں بھی رات کے اس پہر مکمل خاموشی تھی۔ ایک سکوت سا تھا جو رگوں میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ اے سی کی مدھم سی آواز اور ٹھنڈ نے بھی ایک سکونت سی پیدا کر دی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی، نگاہیں سیلنگ پہ ٹکائے ہوئے تھی۔

ہیزل رنگ آنکھوں میں ایک خاموشی پنہاں تھی۔ آج خلاف معمول ان آنکھوں کی ویرانی کچھ

کم تھی۔ نجانے کیوں؟ پتا نہیں کیا وجہ تھی؟ مگر جو بھی تھا، شاید اچھا ہی تھا۔

اس کی زندگی کسی منجھدار کی مانند تھی۔ یوں جیسے وہ کسی بھنور میں پھنسی ہوئی ہو جہاں سے نکلنا مشکل و ناممکن سا ہو۔ مگر اب شاید وہ اس بھنور سے نکلنے کی تگ و دو کرنے لگی تھی۔ مدد بھی تو تبھی ملتی ہے جب ہم مدد کے خواہاں ہوں۔ کامیاب بھی تو وہی ہوتے ہیں جو کامیابی کے خواب دیکھتے ہیں۔ کچھ پاتے بھی تو وہی ہیں جو پانا چاہتے ہوں۔ بالکل اسی طرح ہیل بھی وہی ہوتے ہیں جو ہیل ہونا چاہتے ہوں۔ زخم بھی انہی کے بھرتے ہیں جو مرہم لگاتے ہوں۔

شاید اس نے بھی مرہم ڈھونڈ لیا تھا۔ شاید ہیل ہونے کی خواہش اس کے دل میں بھی جاگی تھی۔

وہ تنہا ہو تب بھی تنہا کہاں رہتی تھی؟ رمیص کی یادیں تو ہر پل، ہر لمحہ ساتھ ہی ہوا کرتی تھیں۔ اس پل بھی وہ تنہا نہیں تھی۔ ذہن میں یادیں گھوم گھوم کر آ رہی تھیں۔ آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ حال پہ ماضی ہاوی ہونے لگا تھا۔ یادیں ذہن کو گھیرنے لگی تھیں۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

ماضی۔۔۔

اس کا تین دن سے رمیص سے کوئی سامنا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ سامنا تو کیا، رمیص تو تین دن سے آفس بھی نہیں آیا تھا۔ پہلے پہل تو وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے جاب سے ہی فائر کر دیا گیا ہو۔ اور یہ سوچ کر نجانے کیوں دل ڈوبتا محسوس ہوا تھا۔

مگر اس کی فکر تب مفقود ہوئی جب بالآخر آج رؤوف صاحب نے اس سے شو کی تیاری کرنے کو کہا اور اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے بالآخر اپنے ذہن میں پنپتا سوال کر ہی ڈالا۔

"سر، شو کون کرے گا؟"، اس کے سوال پر رؤوف صاحب نے خاصی ناسمجھی سے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ پھر کچھ پلوں بعد بے نیازی سے کاندھے اچکائے تھے۔

"جس کا شو ہے، وہی کرے گا۔"، ان کا انداز خاصا سادہ تھا۔ اور تب آخر کار غزل نے ایک طمانیت بھرا سانس لیا تھا۔ پھر چند مزید باتیں کر کے وہ اپنے کیبن میں چلی آئی تھی۔ لبوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ ٹھہری رہ گئی تھی۔ ایک جھگڑا سا جو اتنی دیر سے ذہن میں چل رہا تھا، شانت ہوا تھا۔ ایک الجھن اور فکر جس نے اس کے دماغ کو مفلوج کر رکھا تھا، سلجھ گئی تھی۔

شو کا ٹائم ہونے سے آدھے گھنٹے پہلے وہ نہایت تیزی سے اسٹوڈیو میں داخل ہوا تھا۔ وہ تب کیمرہ ڈائریکٹر کے ساتھ کچھ اہم باتیں ڈسکس کرنے میں مصروف تھی۔ اسے داخل ہوتے دیکھ نجانے کیوں اس کی آنکھیں اس پر ٹھہری رہ گئی تھیں۔ بمشکل اپنا دھیان اس پر سے ہٹا کر اس نے ڈائریکٹر کو چند آخری باتیں بتائیں۔ اس دوران بھی وہ کن اکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی جو ہمیشہ کی طرح کیمرہ ریڈی ہو کر آیا تھا۔

کریم رنگ کی بٹن شرٹ کے ساتھ سیاہ پینٹ پہنے، بال سلیقے سے جیل کے ساتھ پیچھے کو جمائے وہ نہایت سنجیدہ سا لگتا تھا۔ آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں۔ ماتھے پر شکنوں کا جال بچھا تھا۔ آج معمول کی طرح اس نے سب کو سلام بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بس خاموش تھا۔ بالکل خاموش!

سنجیدگی سے اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر اس نے سر اپنے نوٹس پر جھکا دیا تھا۔ غزل سب کچھ ایک نظر دیکھ کر اس کی جانب مڑی تھی اور وہیں کھڑے کھڑے چند پلوں تک اسے تکے گئی تھی۔ وہ نجانے کیوں بہت الگ الگ لگا تھا آج۔ شاید اس کا انداز الگ تھا یا پھر چہرے کے تاثرات۔۔۔ اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ کیا بدلا ہے، مگر کچھ بدلا تو ضرور تھا۔

چند پلوں تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے ایک گہرا سانس خارج کیا تھا اور پھر باقی سب کی جانب مڑی تھی۔ رمیص کی مقابل چیئر پر آج کے مہمان خصوصی، صدّام مقبول صاحب بیٹھے تھے۔ وہ دور حاضر کے فارینٔ منسٹر تھے جن سے رمیص کے روابط یوں بھی خاصے پیچیدہ تھے۔

غزل نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ نجانے آج پھر کیا ہونے والا تھا!

"صدّام صاحب۔ آر یو ریڈی؟"، غزل کے پوچھنے پر صدّام صاحب نے خاصے مغرورانہ انداز میں سر اثبات میں ہلایا تھا اور اپنے سیکریٹری کے کان کے پاس جھک کر کچھ کہا تھا۔ غزل ہلکا سا مسکرا کر رمیص کی جانب مڑ گئی تھی۔ وہ اب تک یونہی اپنے نوٹس پہ جھکا، نوٹس اسٹڈی کر رہا تھا۔ چہرہ اب بھی ویسا ہی سنجیدہ لگتا تھا۔

"مسٹر رمیص!"، اس نے خاصے پیشہ ورانہ لہجے میں اسے مخاطب کیا تو رمیص نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آج اس کی آنکھیں غزل کو بدلی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اس کا انداز سنجیدگی سے بھرپور تھا۔ آنکھیں اس سے بھی زیادہ سنجیدہ لگتی تھیں۔

"آر یو ریڈی؟"

اور اب کے وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔۔۔ بالکل ہلکا سا!

"آئی ایم آلویز ریڈی۔"، کہہ کر وہ پھر سے نوٹس پر جھک گیا تھا۔ غزل نے آخری نظر اسے دیکھنے کے بعد اپنے پورشن کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ اور پھر شو اسٹارٹ ہو گیا تھا۔ رمیص نے شو کا آغاز ویسے ہی ہلکے پھلکے سے سوالات پوچھ کر کیا تھا۔ اپنے ازلی سادہ سے انداز و لہجے میں۔ وقت گزرنے کے ساتھ شو کافی دلچسپ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ رمیص کا ہر شو دلچسپ ہی ہوا کرتا تھا۔ خاص کر غزل کو تو اس کے شوز کچھ زیادہ ہی دلچسپ لگا کرتے تھے۔

پہلا وقفہ شروع ہوا تو سب اپنے اپنے کاموں میں جت گئے۔ رمیص نے پھر سے اپنے نوٹس پر سر جھکا لیا۔ صدّام صاحب اپنے سیکریٹری سے محو گفتگو ہو گئے۔ غزل آگے کے شو کی تیاری کرنے لگی۔ اس کا چہرہ سنجیدہ دکھتا تھا۔

جبھی فاصلے پر بیٹھے رمیص نے دھیرے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ سلک کے سیاہ عبائے میں

ملبوس ہمیشہ کی طرح ڈیسنٹ اور ایلیگنٹ لگ رہی تھی۔ سنجیدگی سے اپنے پی سی پر وہ سب مانیٹر کر رہی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر رمیص نے اپنے نوٹس بند کر کے ایک جانب رکھے تھے، اور چیئر پیچھے کو دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ قدموں کا رخ مصروف سی غزل کی جانب تھا۔ آنکھیں اب بھی ویسا ہی تاثر رکھتی تھیں۔

وہ اس تک پہنچا تو بھی وہ یونہی مصروف رہی۔ شاید اسے احساس نہ ہو سکا تھا کہ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ رمیص نے ہاتھ پشت پر باندھ کر سر سیدھا کیا تھا۔ پھر ہلکا سا گلا کھنکارا تو وہ یکدم ہی کچھ ہل سی گئی اور فورا سے اس کی جانب پلٹی۔ اسے دیکھ کر وہ حیران ضرور ہوئی تھی۔ وہ کبھی اس کے پورشن میں نہیں آیا تھا۔ یہ پہلی بار ہی تھا۔

"کیسی ہیں؟"، اس نے سنجیدگی سے سر ہلکا سا جھکا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو غزل کچھ سیدھی ہوئی۔ پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں الحمدللہ بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں؟ خیریت؟ آج آپ نے سلام نہیں کیا؟"، اس کے سادگی سے پوچھنے پر رمیص بے اختیار ہی مسکرا دیا تھا۔ پھر ہنوز مسکراتے ہوئے ہی اس

نے سر ہلکا سا مزید جھکایا تھا۔ اب کے جب وہ بولا تو آواز میں مسکراہٹ پنہاں تھی۔

"کیا تھا۔۔۔ آپ کو سنائی نہیں دیا۔"، وہ اسے مسکراتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ غزل نے الجھن سے اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں نا سمجھی بھی تھی۔

"مجھے کیوں نہیں سنائی دیا؟"، وہ جیسے اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔ رمیص کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار اس کی جانب ذرا اور جھکا تھا۔

"دل کی باتیں سنائی نہیں دیتیں۔ دل میں کیا تھا سلام۔"، اس نے مسکرا کر دھیرے سے جواب دیا تو غزل کی ابرو بے اختیار ہی اکٹھی ہوئیں۔ چند پل لگے تھے اسے سمجھنے میں۔۔۔ اور پھر اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔ اور سر نفی میں جھٹکا تھا۔

"حد ہوتی ہے ویسے۔۔۔ پھر تو میں نے بھی دل میں ہی جواب دے دیا آپ کو، صحیح ہے؟"

"بالکل صحیح ہے۔"، رمیص نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے خاصا جتا کر جواب دیا تھا۔ اب کے وہ ہلکا سا مسکرائی تھی، پھر رخ مانیٹر کی جانب پھیر لیا تھا۔

"ویسے۔۔۔"، مانٹیر پر ہنوز سر جھکائے اس نے خاصے پر سوچ انداز میں زور دے کر کہا تو رمیص اس کی جانب متوجہ ہوا۔ "آپ تین دن سے آ کیوں نہیں رہے تھے؟ خیریت تھی؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ کو جاب سے ہی فائر کر دیا ہے۔"

اس کی بات پر رمیص قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ پھر یونہی ہنستے ہوئے اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"نہیں۔۔۔ مجھے جاب سے فائر کون کرے گا؟ میں نے تو خود ریزائن کر دیا تھا۔۔۔"، اس نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بتایا تو وہ ایک پل کو ساکت ہوئی اور بے یقینی سے اس کی جانب مڑی۔

"پھر؟"، لہجے میں بے صبری تھی۔ آنکھوں میں سوال۔ وہ ایک بار پھر مسکرا دیا تھا۔

"پھر رؤوف صاحب نے جمال صاحب کو بلا کر خوب کلاس لگائی۔۔۔ اور مجھ سے کہا کہ مجھے زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ کہ آئندہ مجھے ان سے پوچھے بغیر کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔"، اس نے آرام سے سر اٹھا کر سادگی سے بتایا تو غزل نے سمجھ کر سر ہلایا۔ پھر اس کی جانب مڑی۔

"کاؤنٹ ڈاؤن اسٹارٹ ہونے والا ہے۔۔۔ آپ اپنی سیٹ پر جائیے۔"

"آہاں!"، رمیص کہتے ہوئے اس کی جانب ہلکا سا جھکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا کہ غزل نے فوراً ہی نگاہیں چرائی تھیں۔ لب بے ساختہ ہی دانتوں تلے دبائے تھے۔

"میں بہت اچھا اور شریف لڑکا ہوں ویسے۔۔۔ سمجھدار اور ایمان دار بھی۔۔۔ ڈیئرنگ اور بہادر بھی۔ میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"، اس نے اسی شریر سے لہجے میں ہلکا سا مسکرا کر کہا تو غزل کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار سست پڑی۔ اس نے بے اختیار ہی نگاہیں چرائی تھیں۔ رمیص کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"ج۔۔۔ جی؟"، وہ گھبرائی تھی۔ ہکلا کر اس نے چہرہ دوسری جانب موڑ لیا تھا، ایسے کہ اب وہ اسے بالکل بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"آپ بتائیے گا مجھے۔۔۔ کہ میں آپ کو کیسا لگتا ہوں۔۔۔ آئی ول بی ویٹنگ۔"، ہلکا سا مسکرا کر کہتے ہوئے وہ مڑ گیا تھا۔ غزل کے رخسار سرخ ہو کر دہکنے لگے تھے۔ کانوں سے جیسے دھواں نکل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو کمپوز کر کے وہ اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی اور نگاہیں مانیٹر پر جمائی تھیں۔ رمیص اب اپنی سیٹ پر بیٹھا اپنے نوٹس کھول کر سامنے رکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر

اب کچھ دیر پہلے والی سنجیدگی کی جگہ ایک مدھم سی نرم مسکراہٹ رقصاں تھی۔

غزل اب تک سرخ ہو رہی تھی۔ لب سختی سے دانتوں تلے دبا رکھے تھے۔ آنکھیں بار بار حیا سے جھک رہی تھیں۔ ایک تو یہ رمیص جہانزیب بھی ناں! اف اللہ!

حال۔۔۔

آج اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں ٹپکے تھے۔ آج وہ ویسے ہی لیٹی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی تھی۔ رمیص جہانزیب کی یادیں آج حقیقی طور پر کسی نرم فضا کی مانند محسوس ہوئی تھیں۔ کسی تازہ نرم فضا کی مانند!

☆☆☆

حیدر آباد کے مضافات میں فجر کا وقت ہوا تو پرندے اذان ہونے کے کچھ ہی دیر بعد زوروں سے چہچہانے لگے۔ فضا میں پرندوں کی آوازوں کا ایک مدھر گیت بجنے لگا تھا۔ سماعت ان خوبصورت نغموں کو سنتی، دماغ کو پر سکون کر رہی تھی۔ زاویار احمد صاحب کے گھر میں مکمل

خاموشی چھائی تھی۔ محض باہر سے آنے والی چہچہاہٹ نے گھر کی ویران فضا کو معطر کر رکھا تھا۔

ایسے میں چھت کی سیڑھیوں کے ساتھ بنی منڈیر پر کوئی اپنا نرم و ملائم سا ہاتھ پھیرتے، چھت پر آیا تھا۔ آنکھیں ہلکی نم دکھتی تھیں۔ چہرہ ستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بھورے گھنے بالوں کو ڈھیلے جوڑے میں مقید کر رکھا تھا۔ شانوں پہ دوپٹہ پھیلائے، وہ بازو پہ جائے نماز ڈالے اوپر آئی تھی۔

نگاہیں سب سے پہلے سامنے کی جانب اٹھی تھیں۔ سامنے مشرق کی جانب سے ایک گھنی کالی گھٹا قریب آتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک نظر گھٹا کو دیکھا تھا، پھر ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کرتی وہ آگے بڑھ آئی تھی۔ جا کر جائے نماز قبلہ رخ بچھائی، پھر چپل اتارتے ہوئے پیر جائے نماز پر رکھے۔ پھر یونہی گھٹا کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنا دوپٹہ نماز کے سے انداز میں باندھا تھا اور ایک آخری نظر گھٹا کو دیکھ کر اس نے تکبیر کہی۔

سماعت میں پرندوں کی آوازیں رس گھولتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ہلکے ہلکے لب ہلاتی نماز پڑھتی جا رہی تھی۔ کالی گھٹا قریب آتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ آج بہت زوروں کی بارش ہو گی۔

آج معمول کے خلاف پرندے بھی نیچے نیچے ہی اڑانیں بھر رہے تھے۔ شاید ان کو بھی انداز ہو گیا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔

ایسے میں اچانک ہی بادل بہت زور کے گرجے تو سجدے میں جھکے سر کے ساتھ ہی وہ ہل سی گئی تھی۔ سجدے سے سر اٹھا کر آخری کلمات ادا کر کے اس نے نماز مکمل کی اور داہنی جانب سلام پھیر کر ابھی اس نے بائیں جانب سلام پھیرا ہی تھا کہ سامنے ہی زاویار صاحب کھڑے نظر آئے۔ وہ ایک پل کے لیے تو ٹھہر ہی گئی تھی۔ مگر پھر ہاتھ دعا کے لیے فضا میں بلند کیے اور چند ہی پلوں بعد چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے جائے نماز اٹھاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے اس نے چپل پیروں میں اڑسیں اور نیچے کی جانب قدم بڑھائے۔ بے اختیار ہی زاویار صاحب ایک قدم آگے بڑھے تھے۔

"بیٹے۔"، ان کے لہجے میں ٹوٹے دل کی، ٹوٹے مان کی کرچیاں شامل تھیں۔ بوڑھی آنکھیں سرخ و نم سی ہو رہی تھیں۔ یوں جیسے وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہے ہوں۔ صبر کی آخری حد پر ہوں اور برداشت اختتام کو پہنچ چکی ہو۔ فاطمہ کے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی رک

گئے تھے۔ چند پل ٹھہر کر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ سادہ سے سفید شلوار قمیض پہنے، وہ بہت بکھرے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ اپنی من پسند اولاد کی ناراضگی ان سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"جی بابا؟"، اس کا انداز و لہجہ بے لچک تھا۔ آنکھیں سپاٹ کر لی تھیں۔ چہرہ بھی۔ وہ ایک قدم مزید قریب آئے تھے، یوں کہ اب وہ اس کے بالکل مقابل اس سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ وہ چہرہ اٹھائے انہیں سوالیہ نگاہوں سے تک رہی تھی۔

"ناراض ہو اپنے بابا سے؟"، ان کا لہجہ مدھم تھا۔ آنکھیں اس کے چہرے پر ہی ٹکی تھیں۔

"کیا نہیں ہونا چاہئے؟"، اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت سیدھے انداز میں پوچھا تو انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"تم کسی اور کی وجہ سے اپنے بابا سے ناراض ہو رہی ہو؟"، فاطمہ کی بھنویں ناسمجھی اور افسوس سے اکٹھی ہوئی تھیں۔ دکھ سے وہ ایک قدم اور قریب آئی تھی۔

"کیا ایمان اور امّاں "کسی اور" ہیں؟ کیا واقعی؟"، اس کے لہجے میں حیرت ہلکورے لے رہی

تھی۔ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ مٹھی ضبط سے بھینچی ہوئی تھی۔ زاویار صاحب نے بے اختیار نگاہیں چرائی تھیں۔ شاید فاطمہ سے نہیں، حقیقت سے۔

"آپ جانتے ہیں، بابا؟ آپ نے پرسوں ہاتھ امی پر اٹھایا تھا۔۔۔ مگر زخمی میرے دل کو کر دیا تھا۔ گھر سے آپ نے ایمان کو نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ مگر دل سے آپ میرے نکل گئے تھے۔ میں بچپن سے سب دیکھتی ہوئی آ رہی تھی۔۔۔ مگر جانتے ہیں کہ خاموش کیوں رہتی تھی؟"، اس کا لہجہ تلخ اور آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ مگر اس کا دھیما پن بھی چیخ چیخ کر اس کے درد کا اعلان کر رہا تھا۔ زاویار صاحب جھکی نظروں کے ساتھ اس کو سن رہے تھے۔ "کیونکہ میں خود غرض تھی۔ باپ کی محبت میں اندھی ہو کر تمام زیادتیوں، تمام ناانصافیوں کو دیکھ کر بھی ان دیکھا کر رہی تھی۔ مگر جانتے ہیں؟ آپ نے میرا اعتماد خاک میں ملا دیا ہے۔۔۔ میں، جو بچپن سے اپنے باپ کو کسی آئیڈیل ہیرو کی طرح سمجھ رہی تھی، بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھی۔ بھول گئی تھی کہ یہ "ہم" جیسے انسانوں کی دنیا ہے۔ اور "ہم" جیسے انسان ہیرو نہیں ہوتے۔۔۔ ہم صرف ولن ہوتے ہیں۔ کبھی اپنی، تو کبھی دوسروں کی اسٹوری کے۔ آپ نے میرا اعتماد بہت بری

طرح سے توڑا ہے، بابا۔ میں شاید اب کبھی کسی پر اعتماد نہ کر پاؤں۔"، اس کی آنکھوں سے ایک گرم گرم آنسو ٹوٹ کر گرا تھا۔ زاویار صاحب کے دل میں اس کے یہ الفاظ تیر کی مانند کھبتے جا رہے تھے۔ وہ تکلیف سے سر جھکائے سب سن رہے تھے۔

"کیا قصور تھا ایمان کا؟ یہی کہ اسے اللہ نے ویسا پیدا کیا جیسا کہ وہ چاہتا تھا؟ اور ویسا پیدا نہ کیا جیسا آپ چاہتے تھے؟ یا پھر یہ کہ اللہ نے مجھے سفید رنگ دیا اور اسے گندمی؟ فار گاڈ سیک، بابا۔۔۔ نکل آئیں اب ان دقیانوسی باتوں سے۔ کیا یہ رنگت انسانوں سے زیادہ اہم تھی آپ کے لیے؟ آپ تو باپ تھے۔ آپ کے لیے تو اولاد اہم ہونی چاہیے تھی۔ نہ کہ اس کی رنگت، قد، نقش و نقوش۔"، وہ کہتے کہتے ہانپنے لگی تھی۔ وہ چیخ نہیں رہی تھی۔ بلکہ اس کی آواز مدھم سے مدھم تر ہوتی جا رہی تھی۔ شاید یہ دکھ تھا جس نے اس کے گلے کو جکڑ لیا تھا۔ آنسو آہستہ آہستہ پلکوں کی باڑ سے آزاد ہوتے ایک ایک کر کے گالوں پر سے پھسلتے جا رہے تھے۔ "ماں باپ تو ماں باپ ہوتے ہیں ناں بابا؟ ان کے لیے تو اولاد اہم ہوتی ہے۔ نہ کہ یہ کہ اولاد کالی ہے یا گوری۔۔۔ آپ نے اپنی بے جا باتوں اور انا کو لے کر میری بہن کا دل مار دیا، بابا۔ میری اتنی پیاری، اتنی

ٹیلنٹڈ، اتنی نرم خو بہن کو آپ نے (اس نے ان کی جانب انگلی اٹھائی تھی) آپ نے برباد کر دیا۔ اس کی ہنسی، اس کی خوشی اس سے چھین لی۔ اسے خزاں کا وہ پتّا بنا ڈالا جو لوگوں کے پیروں تلے آ کر روندتا چلا جاتا ہے۔۔۔ روندتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ ختم ہو جاتا ہے۔"

زاویار صاحب اب بھی جھکے سر کے ساتھ سب سنتے جا رہے تھے۔ کیا وہ شرمندہ ہو رہے تھے؟ کیا واقعی؟

"کبھی کبھار تو میں اس سے جلن کرنے لگتی تھی، بابا۔ وہ مجھے بہت حسین لگتی تھی۔ اس کے نقوش، اس کی گندمی رنگت، سب مجھے بہت پسند تھا۔ آپ کے بچوں میں سے سب سے ٹیلنٹڈ۔۔۔ ہاں، مانا کہ وہ پڑھائی میں کبھی بھی بہت اچھی نہیں رہی۔۔۔ مگر اس کی آواز، اس کے سر، اس کا آرٹ، اس کا کرافٹ، اس کی لکھنے کی صلاحیت۔۔۔ سب کچھ ہی ناقابلِ بیان تھا، بابا۔ کبھی کبھی تو میں سوچتی تھی کہ ایک بندہ اکیلے اتنے سارے ٹیلنٹز کا مالک کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ کیسے ایک اکیلا شخص اتنا کچھ کر سکتا ہے۔۔۔ مگر آپ نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی تو

دور کی بات، دو لفظ تعریف تک کے بھی نہیں بولے۔ انٹر میں خوب محنت کر کے اس نے اے پلس گریڈ لے لیا۔ تب بھی آپ نے اسے ایک "شاباش" کے علاوہ کچھ نہیں بولا۔"، اب کے وہ سر نفی میں افسوس سے ہلاتی ایک قدم پیچھے ہوئی تھی۔ گال آنسوؤں سے پوری طرح بھیگ چکے تھے۔ زاویار صاحب نے بے اختیار ہی سر اور نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ ان کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھی تھی۔ وہ اس کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کبھی نہیں!

"آپ ایک بیٹی کو انجینیئر بنانے کے خواب دیکھتے ہیں۔۔۔ اور دوسری کو تو پڑھنے ہی نہیں دیتے۔ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے پیچھے پڑے ہیں۔ کیا یہ ناانصافی نہیں ہے، بابا؟ کیا آپ کے اصول اتنے کھوکھلے ہیں کہ ایک بچّی کے سامنے آپ اپنی انا کو چن لیتے ہیں؟ بچّی بھی آپ کی اپنی؟ ماں باپ ایسے تو نہیں ہوتے، بابا۔۔۔ ایسے تو بالکل نہیں ہوتے۔"، وہ متورم لہجے میں افسوس سے سر نفی میں ہلاتی بولتی جا رہی تھی اور زاویار صاحب نم آنکھوں سے اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔

"جانتے ہیں آپ، کہ جس لڑکی کا اعتماد اس کا باپ توڑ ڈالے، وہ دنیا میں کبھی کسی مرد پر بھروسہ

نہیں کر پاتی؟ آپ نے ایمان کے ساتھ ساتھ فاطمہ زاویار خان کا بھی اعتماد کرچی کرچی کر ڈالا ہے، بابا۔ آج میں آپ سے امّاں کی بات نہیں کر رہی۔ وہ تو آپ کا خون نہیں ہیں ناں۔۔۔ آج میں آپ سے صرف آپ کے خون کی بات کر رہی ہوں۔۔۔ اور کچھ نہیں۔"، کہتے ہوئے وہ یکدم ہی ٹھہری تھی اور ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھیں رگڑ کر پونچی تھیں، اور اگلے ہی پل دوڑتے ہوئے نیچے بھاگ گئی تھی۔ پیچھے زاویار صاحب نے ایک نم سانس خارج کیا تھا۔ وہ اپنی من پسند اولاد کی ناراضگی برداشت نہیں کر پارہے تھے۔ انہیں آج بھی ایمان کی فکر نہیں تھی۔

کیا باپ ایسے بھی ہوا کرتے ہیں؟

کیا واقعی؟

جاری ہے۔۔۔

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔ تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک، انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP: